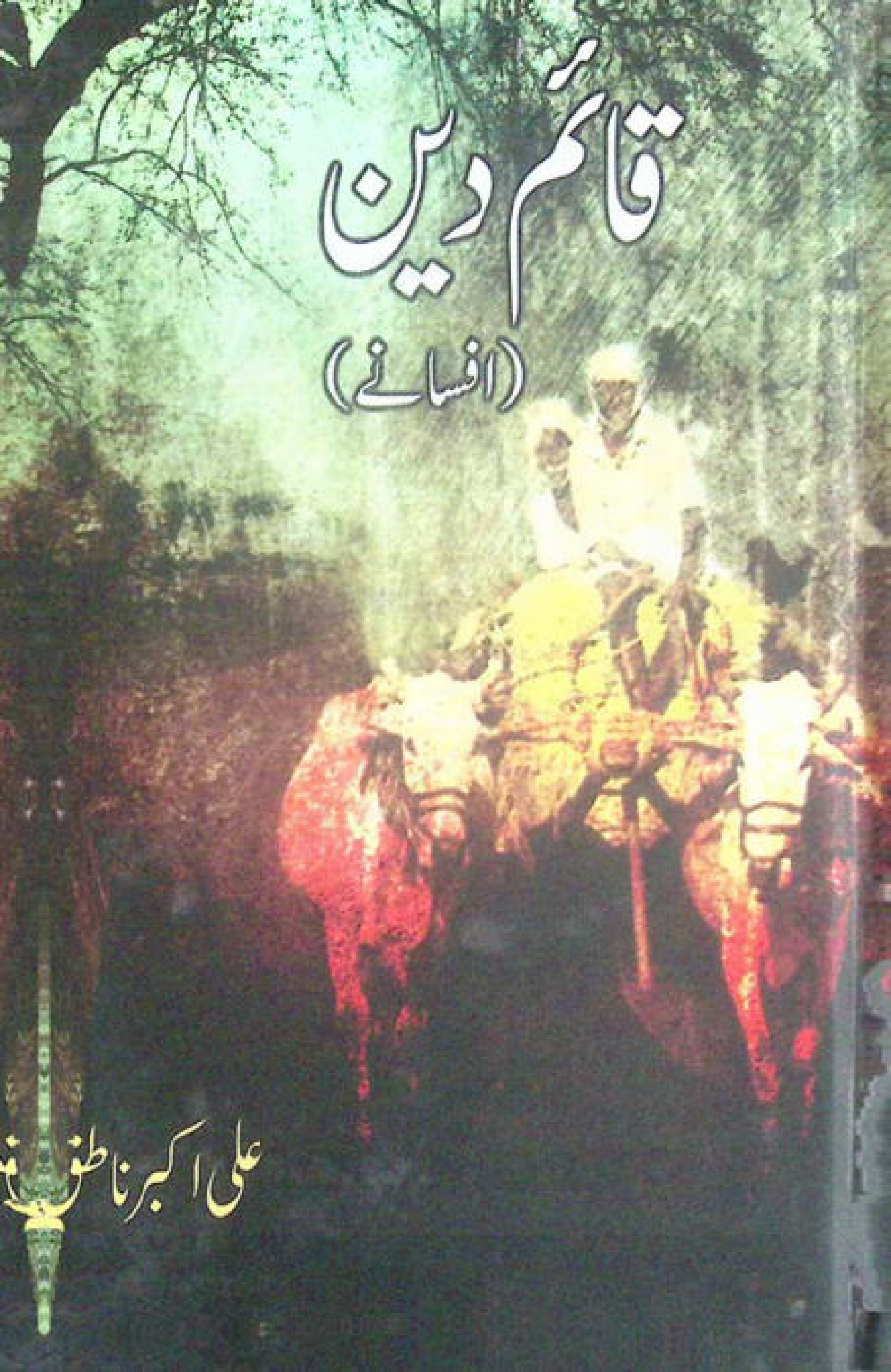

قائم دین
(افسانے)
علی اکبر ناطق

maablib.org

قائم دین

قائم دین

علی اکبر ناطق

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

maablib.org

علی اکبر ناطق　　　افسانے　　　قائم دین

اشاعت اول : 2018

اشاعت دوم : 2018

اشاعت سوم : 2019

سرورق : [illegible]

قیمت : 300

Qaim Deen

(Urdu short stories by Ali Akbar Natiq)

Copyright © 2019 - 3rd Edition

Except in Pakistan this book is sold subject to the condition that it shall not, by way of trade or otherwise, be lent, resold, hired out or circulated without the consent of the author or the publisher in any form of binding or cover other than that in which it is published.

Printed by:
Naveed Hafeez Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 300.00

Published by:

SANJH PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN:978-969-593-267-4

افتخار عارف کے نام

فہرست

اچھو بازی گر	9
بے چارگی	14
قائم دین	21
جودھ پور کی حد	34
کی بھائی	40
معمار کے ہاتھ	49
مولوی کی کرامت	64
موسن والا کا سفر	70
نرینہ اولاد	77
شہابو خلیفہ کا شک	82
شاہ مدار کی پازیبیں	94
شریکا	104
تابوت	111
والٹر کا دوست	117
شیدے نے پگڑی باندھ لی	125

اچھو بازی گر

اگر میرا باپ بھی بازی گر ہوتا تو پھر دیکھتا کہ اچھو کیسے جیت جاتا۔ اِس کو چھلانگ لگانے کے سارے گُر اِس کے باپ نے بتائے ہیں۔ تمھیں پتہ ہے؟ نورو بازی گر دن رات اِسے ورزش کرواتا ہے۔

میں نے یہ بات اپنی خفت مٹانے کے لیے اور اپنے جگری یار مھانے کو تسلی دینے کے لیے کی جو میری ہی طرح نرم و نازک اور خوبصورت تھا۔ اُس کو میری شکست کا واقعی دُکھ تھا۔

چھلانگ میں جیت گیا تو کیا ہوا؟ "مھانے نے کہا" کلاس میں نمبر تو ہمارے ہی زیادہ آتے ہیں۔

پرسوں دیکھا! ماسٹر اشرف نے کیا کہا تھا؟ اچھو تو صرف چھلانگیں ہی لگا سکتا ہے، پڑھنا تیرے بس کا روگ نہیں۔" میں نے مھانے کی بات کی مزید وضاحت کی"۔

اتنا کہہ کر ہم نے دل کا اُبال تو نکال لیا مگر مجھے معلوم تھا کہ میں تو کیا مھانا بھی سے مطمئن نہیں تھا۔

پھر ایک دن جب ہیڈ ماسٹر نے اچھو بازی گر کو قلا بازیاں لگانے پر پچاس روپے انعام اور تھپکی دی تو ہم اور بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ کیسے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔ اُس کے باپ کو سکول میں بُلا کر اچھو کی کھیلوں میں بہتر کارکردگی پر مبارکباد دی۔ خدا جانتا ہے وہ دن میرے حسد اور رشک کی انتہا کا تھا۔ میں نے دل میں خدا سے شکوہ کیا کہ اُس نے ہمیں کیوں نہ بازی گر بنایا۔

اُس دن نورو بازی گر نے خوشی سے وہ ڈھول بجایا کہ کان پھٹنے لگے۔ کلاس کے تمام لڑکے سوائے میرے اور مھانے کے اچھو ہی کی تعریفیں کرتے رہے۔

سکول میں وقفۂ تفریح کے دوران اکثر فٹ بال کے میچ کھیلے جاتے۔ اس کے لیے جب کھلاڑیوں کی دو طرفہ تقسیم ہوتی تو ہر فریق اچھو کو اپنی ٹیم میں رکھنے کی خواہش کرتا۔ حتیٰ کہ اس کے لیے ٹاس کی جاتی جب کہ ہم دونوں نے کھیلنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ کھیل کے دوران کوئی ہمیں کہنی مارتا اور کوئی ٹانگ اڑا کر گرا دیتا۔ خاص کر اچھو کے سامنے آتے ہماری جان جاتی۔ رفتہ رفتہ پوری کلاس میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف میں اور مھانا اور دوسری طرف اچھو اور ساری کلاس۔

اگر شہر ہمارے گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہ ہوتا یا گاؤں میں کوئی اور سکول ہوتا تو ہم یقیناً وہ سکول چھوڑ دیتے مگر اب مجبوری تھی۔ ادھر روز بروز اچھو کی بدمعاشیاں بڑھتی گئیں۔ اُس کے دو ہی کام رہ گئے تھے، لمبی لمبی چھلانگیں لگانا اور ہم دونوں کو تنگ کرنا۔ اُس پر ستم یہ کہ اُسے کلاس کا مانیٹر بھی بنا دیا گیا۔ اب ہماری جان اور شکنجے میں آ گئی۔ اساتذہ کو شکایت کرنے کی ہمت بھی نہ رہی کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اور زیادہ تنگ کرتا۔

ایک دن استاد کی غیر موجودگی میں مَیں اور مھانا کلیلہ و دمنہ کی کہانی پڑھ رہے تھے۔ دوسرے لڑکے اچھل کود اور دھینگا مشتی میں مصروف تھے کہ اچانک اچھو اور اُس کے چار پانچ چیلے ہم پر ٹوٹ پڑے، زبردستی ہمارا منہ چومنے لگے۔ میرے ہاتھ میں ایک نوکیلی پنسل تھی۔ میں نے غصے میں آ کر زور سے وہی اچھو کے پیٹ میں چبھو دی۔ مھانے نے ایک لڑکے کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ نتیجتاً انہوں نے ہماری خوب دھلائی کی۔ جب ہم رونے لگے تو چھوڑ دیا۔

دوسرے دن میں نے ماسٹر جی سے شکایت کی۔ ماسٹر نے اچھو کو بلایا تو اُس نے کہا، اُستاد جی یہ جھوٹ بولتا ہے بلکہ اس نے مجھے بازی گر بھی کہا تھا۔ اُس پر بھی میں نے اسے کچھ نہیں کہا، چاہے ساری کلاس سے پوچھ لیں۔ جب کلاس سے پوچھا گیا تو اُنہوں نے ہمارے خلاف گواہی دے دی لہٰذا ماسٹر نے اُلٹا ہمیں کو ڈانٹا۔

اُس دن سے ہم اور زیادہ سہم گئے اور حیران ہوئے کہ بازی گر کہنے پر یہ آخر کیوں بگڑا اسے تو فخر کرنا چاہیے تھا۔ پوری کلاس سے ہماری بول چال ختم ہو گئی۔ اچھو کی شہ پر لڑکے ہم پر طرح طرح کے آوازے کستے۔ اس پر غضب یہ کہ اُستاد نے مجھے بلبل اور مھانے کو مینا کا نام دے رکھا تھا۔ لڑکے بھی تقلید میں ہمیں انہی ناموں سے پکارتے۔ ہمارے لیے سال کے وہی دن خوشی کے ہوتے جو امتحان کے دن ہوتے کیونکہ امتحان مارچ میں ہوتا تھا۔ جب بہار زوروں پر ہوتی۔

دیہات میں ہر طرف سرسبز کھلیان، پھول، اُڑتے ہوئے بھورا اور چہکتے پرندے دھوم مچاتے۔ سارا سکول گیندے اور گلاب کے پھولوں سے مہک اُٹھتا۔ ہرے ہرے درخت کونپلیں نکالتے اور ہلکی ہوا سے اِدھر اُدھر جھومتے تو دل میں ایک ٹھنڈک اُتر جاتی۔ اُس وقت ہم سوچتے کہ اب بدلا لینے کے دن ہیں۔ لہٰذا 31 مارچ کا دن ہم دونوں کی کامیابی کا دن ہوتا۔ رزلٹ بولا جاتا تو ہمیشہ ہم فرسٹ سیکنڈ آتے۔ گیندے اور گلاب کے ہار اُستاد کے گلے میں پہناتے اور کچھ ہدیہ بھی ضرور دیتے۔ اِس کے ساتھ ہی ہمیں اِس بات پر تھوڑی سی تکلیف بھی ہوتی کہ اُستاد اچھو اور اُس کے چیلوں کو بھی پاس کر دیتا جس کی ہم بالکل توقع نہ کرتے۔

میرا گھر سکول کے ساتھ پڑتا اِس لیے محاتا چھٹی کے وقت میرے گھر ہی پناہ لیتا۔ جب تمام لڑکے گھور جاتے تب وہ اپنے گھر جاتا کہ لڑکوں کے شر سے محفوظ رہے۔ اُس کا گھر گاؤں کے مرکز میں تھا۔

رفتہ رفتہ اچھو نے پڑھنا بالکل ترک کر دیا لیکن اُستاد اُسے اگلی کلاس میں ترقی دیتے رہے کیونکہ سالانہ کھیلوں کے ٹورنامنٹ میں وہ سکول کے لیے عزت کا باعث بنتا کہ کبڈی اور فٹ بال میں اُس کا دُور دُور تک ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ کھیل کے میدان میں رہتا اور اساتذہ نے بھی کبھی اُسے پڑھنے کو نہیں کہا۔ نہ ہی اُس نے خود توجہ دی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ وہ پاس ہو جائے گا۔

آٹھویں کلاس کے بعد اچھو نے اپنے کرتب اور قلابازیوں کا میدان اور وسیع کر لیا۔ اپنے باپ کے ساتھ دوسرے گاؤں میں جا کر میلوں ٹھیلوں میں کرتب دکھانے لگا اور سکول سے اکثر غیر حاضر رہتا لیکن اساتذہ نے حاضری رجسٹر سے اُس کا نام خارج نہ کیا اور نہ ہی غیر حاضری پر بھی باز پرس کی۔ اساتذہ کی اس پردہ پوشی پر میں اور محاتا ضرور کڑھتے کہ آخر اُستاد اِس کو سزا کیوں نہیں دیتے یا پھر اِس کا نام کیوں خارج نہیں کرتے۔

جس دن وہ سکول نہ آتا ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے آج ہم نے کھل کر سانس لی ہے۔ نویں کلاس میں پہنچے تو اچھو اور زیادہ اپنے کام میں پروفیشنل ہو گیا۔ اب اُس نے ہمیں بھی تنگ کرنا کم کر دیا بلکہ اب تو ہمیں اُس کے لہجے میں نرمی محسوس ہونے لگی۔ ہفتے میں ایک آدھ دن سکول آتا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لڑکے بھی ہمارے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کر گئے۔ نویں کلاس کے آخری دنوں میں تو وہ ہماری عزت بھی کرنے لگا۔ یہ بات اگرچہ ہمارے لیے حیرت کا باعث تھی

لیکن ہم نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ البتہ اتنا ہوا کہ ہمارے دل میں اچھو کے خلاف جو کدورت تھی وہ بھی آہستہ ڈھل گئی۔ اس سال اُس نے سکول کے ٹورنامنٹ میں بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ پہلی دفعہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر میں اور معانے نے بھی اُس کی شان میں نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔ اس سال اچھو سکول سے اکثر غائب رہا اور جب دسویں کا بورڈ کی طرف سے امتحان ہوا تو وہ دوسرے کئی لڑکوں کے ساتھ فیل ہو گیا لیکن ہم دونوں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور کالج میں داخلہ لے لیا۔

اچھو نے تعلیم بالکل چھوڑ دی اور مکمل طور پر اپنے آبائی کام کو اپنا لیا۔ اب وہ ڈھول بھی بڑے عمدہ طریقے سے بجالیتا اور نورو بازی گر کی جگہ لے لی۔ نورو کا کام بس ہلاشیری کرنا رہ گیا تھا۔ باقی سب کچھ اچھو نے سنبھال لیا۔

معانے کے والدین گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسے اور معانا بھی اُن کے ساتھ شہر رہنے لگا۔ البتہ کالج میں ہم روزانہ ملتے۔ حتیٰ کہ معانے نے بی۔ اے کر لیا اور شہر کے ایک سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ اس عرصے میں ہم نے اچھو کے متعلق کبھی بات نہ کی اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب میٹرک کیے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ میں نے ایم اے کر لیا تھا۔ گاؤں میں آتے جاتے اچھو سے ٹاکرا ہوتا۔ تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام بھی کرتا۔ میں سلام کا جواب تو دیتا لیکن اُس سے زیادہ کھلتا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زمانہ آگے نکل گیا۔ اب بچے بازی گروں کے تماشوں کی بجائے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لطف لینے لگے۔ لوگوں نے بازی گروں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ وہ ہالی ووڈ کے بہترین ایکشن دیکھ سکتے تھے۔ اس ماحول میں کوئی اچھو کی قلابازیوں پر کیا دھیان دیتا۔ اب وہ بیاہ شادیوں میں ڈھول بجا کر اپنا وقت بہلانے لگا اور گاؤں میں سالانہ بازی بھی لگاتا جس سے اُس کا سال بھر کا خرچہ نکل آتا۔ یہ بازی تو اب ایک بہانہ رہ گئی تھی۔ روپیہ پیسہ تو لوگ اُسے گاؤں کا بازی گر ہونے کی حیثیت سے دیتے تھے۔ ہم نے خود نورو بازی گر کو گندم، کپڑے اور پیسے کئی دفعہ دیے، جب وہ لینے آتا۔

میٹرک کے بعد پندرہ سال گزر گئے لیکن معانے اور اچھو کا کبھی سامنا نہ ہوا نہ اُس نے کبھی پوچھا نہ میں نے بتایا۔

معانے نے اپنی شادی پر کلاس فیلوز میں صرف مجھے بلایا۔ اُس کی شادی بھی ایک سکول

ٹیچر سے ہوئی اور شہر میں اُس نے اپنا ایک خوبصورت گھر بھی بنالیا۔

اب گاؤں کے اکثر لوگ میرے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے عزت کرنے لگے۔ میری منگنی بھی ایک پڑھی لکھی اور آفیسر لڑکی سے ہوگئی اور مجھے ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ یوں گاؤں میں میری عزت اور وقار میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ملازمت کے ایک سال بعد میری شادی ہوئی تو میں نے سید امان اللہ شاہ کو بطور خاص بلایا۔ شام کے وقت ہم دیگر احباب کے ساتھ بیٹھے مزے سے شادی کی خوشی منا رہے تھے کہ اچھو ڈھول لے کر آگیا۔ اُس نے دھوتی اور کرتہ پہنا ہوا تھا اور پاؤں میں ٹائر کا جوتا تھا۔ اچھو نے ڈھول زمین پر رکھ کر پہلے جھومر ڈالی، اُس کے بعد پہلو بدل بدل کر ڈھول بجایا، جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ ارد گرد کئی بچے بھی جمع ہوگئے۔ میں نے اور سید امان اللہ شاہ نے ٹو پیس سوٹ پہنے تھے جو ہمیں خوب جچ رہے تھے۔ اچھو کوئی بیس منٹ بعد اپنا کھیل ختم کر کے آگے بڑھا اور ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ میں نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اُسے دیا۔ اُس نے کہا! دو ہزار سے کم نہیں لوں گا اور ہزار روپے تمہارے بچپن کے دوست شاہ صاحب سے لوں گا۔ ہم نے اُسے پیسے دیے تو وہ بہت زیادہ خوش خوش چلا گیا۔ اُسے جاتے دیکھ کر سید امان اللہ شاہ نے حیرانی سے پوچھا، یار علی! اسے کیسے پتہ ہے کہ ہم بچپن کے دوست ہیں۔ میں نے کہا، یا اچھو بازی گر ہے اور اس نے تجھے پہچان لیا ہے کہ تُو محمد عارف مینا ہے۔ یہ سُن کر امان اللہ حیرت سے اچھو کو جاتے ہوئے تکنے لگا پھر اُٹھ کر میرے گلے لگ گیا۔ فرط جذبات سے ہمارے آنسو نکل آئے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ یہ آنسو بچپن کی یادوں کے تھے یا اچھو بازی گر کے لیے۔

بے چارگی

نورے نے عرض کیا راؤ صاحب وہ مال تو فیضاں کا ہوا کیونکر واپس کرے گی۔ بیچاری ساری رات گھنگرو باندھ کر ناچی پھر کونسا اُس نے چھینا ہے، راؤ شوکت خاں نے خوشی سے دیا۔

بھڑوے تُو مجھے سمجھاوے ہے، راؤ عبدالجمیل خاں گرج کے بولا سہر میں گند پھیلا رکھا ہے سر پھے لوگوں کا تم نے راستہ بند کیا ہے۔ ایک تو مرا بیٹا کھراب کر دیا، اُپر سے کہوے ہے خوسی سے دیا۔

راؤ صاحب "نورا دوبارہ لڑکھڑاتی زبان سے بولا" شوکت خاں کو ہم کیسے روک سکتے ہیں، وہ تو کئی دن سے ہم خود تکلیف میں ہیں مگر رو کیں تو شہر میں رہیں کیسے؟

اچھا، تو یوں کہو کہ مرے بیٹے کی وجہ سے تمہیں تکلیف ہووے۔ جمیل خاں ایک دم بھڑک اُٹھا، فیضاں کو تکلیف ہووے۔ تری ماں جو رنڈی ہے، جس نے کوئی مرد سہر میں نہیں چھوڑا، اُسے تکلیف ہووے۔ ابے حرام کے تُو ہمیں سمجھاوے؟ ہمیں تکلیف بتاوے؟ ٹھہر تجھے میں بتاؤں ہوں۔ یہ کہہ کر ہاتھ میں پکڑا بیت ایک دم نورے کے مُنہ پہ مارا جس کی وجہ سے اُس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ چل نکلا۔

اُس کے ساتھ ہی حبیب خاں نے راؤ جمیل کو آگے بڑھ کر پکڑ لیا لیکن جمیل خان غصے سے کانپ رہا تھا، اُلٹا کہوے سہر میں رہویں کیسے گویا ہم ظالم ہیں۔ او پورے سہر کی اکیلی اولاد، آج سام سے پہلے میرا دس ہجار میری میج پہ ہووے جو رات سوکت فیضاں کو دے آیا ہے۔ ورنہ صبح ساری رقم تیری ماں کی (چ) سے نکال لوں گا اور تینوں کا قیمہ الگ بناؤں گا۔ سُن لیا تے؟ اب جا دپھا ہو جا یہاں سے۔

اور اپنی بیت منیر سوچی کو دیتے ہوئے، اسے اچھی طرح کلمہ پڑھ کے دھولا۔ کس پلید کو جا لگی۔

اب نورے کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ راؤ جمیل کا ایک ایک لفظ پہاڑ کی طرح اس کے سر پر گرا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے ڈیرے پر بیٹھا ہر شخص چڑیل ہو اور اگر جلدی یہاں سے نہ گیا تو وہ اپنے ناخن اُس کے سینے میں داخل کر کے کلیجہ نوچ لیں گے۔

جیسے باہر نکلنے کے لیے مُڑا، اُس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرا گیا اور منہ کے بل گر پڑا۔

دیکھ کے چل اندھے، غیرت کے ساتھ کیا آنکھیں بھی گئیں۔" ڈیرے پر بیٹھا ایک اور بولا"۔

نورے نے جلدی سے اپنا صافہ ہونٹ اور ناک پر رکھا جو بُری طرح زخمی ہو گئے تھے اور باہر نکل گیا۔

گھر پہنچنے تک پورا صافہ خون سے بھر گیا۔ وہ دیکھ کر حیران کہ اتنا خون بہہ گیا مگر اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ اُس نے سوچا شاید جو دلے ہوتے ہیں انہیں درد نہیں ہوتا۔ میں تو اوپر سے رنڈی کا بیٹا ہوں، پورے شہر کی اکیلی اولاد۔

بڑبڑاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ شریفن نے دیکھ لیا۔

ہائے نورے تجھے کیا ہوا؟ اللہ نہ کرے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا۔ لاکھ بار کہا یہ رکشہ چلانے کا دھندا چھوڑ۔ اللہ فیضاں کو سلامت رکھے۔ ہم کون بھوکے مرتے ہیں کہ سارا دن دھواں کھائیں۔ ماں صدقے سارے چہرے کا ستیاناس کر لیا۔

اماں یہ اسی فیضاں کی وجہ سے ہوا" نورا غصے سے چیخا۔"

ہائیں! شریفن ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اُے ہے، اُس بیچاری نے کیا کیا؟ ایک تو کما کر کھلاتی ہے، اوپر سے وہی قصور وار۔ خبردار جو اُس کو کچھ۔ اُس کی ماں نے مرتے وقت مجھ کو سونپا اور میں نے بیٹی کی طرح پالا پوسا۔ تُو تو نکھٹو اور آوارہ نکلا۔ نہ طبلے کی جانچ۔ نہ بیٹی کا فن۔ بس موئے رکشے کی پھٹ پھٹ اور دو دو ٹکے کی سواری۔ میں کہتی ہوں جو اپنا پیشہ چھوڑتا ہے ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔ شریفن کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری ہیرا منڈی نورے اور شریفن کے گرد سٹ آئی۔ اسی شور میں فیضاں کی آنکھ بھی کھل گئی، جسے رات ایک لمحے کو سکون نہ ملا تھا۔ آنکھیں ملتی ہوئی صحن میں

آ گئی اور دیکھ کر حیران ہوئی کہ ماجرا کیا ہے۔

جب ہر طرف سے سوالات کی بارش ہوئی تو نورا پھٹ پڑا۔

ہاں میں وڈلا، میں بھڑوا، سارے شہر کی اکیلی اولاد اور یہ رنڈی، جس نے کوئی مرد شہر میں نہیں چھوڑا۔ غصّے میں نورے کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اُدھر شریفن سمیت تمام محلے والوں نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں۔

اچانک نورے کو یاد آیا کہ آج پہلی دفعہ اُس نے ماں کو رنڈی کہا۔ کچھ دیر چپ کر کے پھر بولا۔

اُدھر وہ آتا ہے اور ساری رات اِس کو نچاتا ہے۔ یہ کنجری، یہ سب کنجریاں، سارا محلّہ دِنوں کا منہ دیکھتا ہے۔ یہ کہہ کر نورا اندر چلا گیا۔ پھر آہستہ سے اُس کے پیچھے فیضاں بھی۔

☆☆☆

نورے کو گھر سے گئے تیسرا دن تھا۔ شریفن اور فیضاں نے کس کس سے نہیں پوچھا ہر معلوم ٹھکانے سے پتہ کرایا۔ کہیں سے خبر نہ ملی۔ دونوں سخت پریشان کہ اب کیا کریں۔ اُدھر فیضاں ہر گاہک کو باہر ہی سے ٹرخا رہی تھی۔ پریشانی میں اُسے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

آج پھر عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس عالم میں فیضاں کوٹھے کی چھت پر ٹہلتی اور نورے کے بارے میں سوچتی رہی کہ اچانک کار کے رُکنے کی آواز آئی۔ اُس نے اوپر سے جھک کر دیکھا تو مزید پریشان ہو گئی۔ راؤ شوکت لڑکھڑاتا ہوا اُس کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اتنے میں شوکت خاں بغیر دستک دیے اندر گھس آیا۔

فیضاں چھت سے اُتری تو دیکھا۔ شریفن اُس سے ٹال مٹول کر رہی ہے۔ مگر فیضاں نے دیکھا کہ اُس کی باتوں کا شوکت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا بلکہ نشے کی حالت میں وہ فیضاں کو تکتا چلا جا رہا ہے۔

اُس رات فیضاں پھر ایک پل نہ سو سکی۔ بچاری انکار کرتے بھی ڈرتی تھی کہ اُس کے باپ کا شہر میں طوطی بولتا تھا۔ ذرا چوں چرا کرتی تو ٹھکانا نہ ملتا۔ رات کے پچھلے پہر جب فیضاں نے شوکت کو راؤ جمیل خاں کی طرف سے کی گئی توہین یاد دلائی تو وہ اُلٹا بھڑ گیا۔

سُسری تو چاہتی ہے میں ابا کو رگیدوں۔ شکر کرو نورا زندہ ہے ورنہ جیسے ابا کے آگے وہ بولا تھا میں ہوتا تو ٹکڑے کر کے کتوں کے دھورے پھینک دیتا۔ یہ کہہ کر ہزار روپیہ فیضاں کے آگے پھینکا اور باہر نکل گیا اور فیضاں ڈر کے مارے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ روپیہ لیتے جاؤ ورنہ کل اُسے دو ہزار واپس کرنا پڑیں گے۔

ابھی فیضاں کی آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو نورا سامنے کھڑا تھا۔ فیضاں تو پیچھے ہی کھڑی رہی مگر شریفن نورے سے لپٹ گئی اور منہ سر چومنے لگی لیکن وہ پتھر کی طرح کھڑا رہا۔ اس سے پہلے کہ اُس سے کچھ پوچھتیں، نورا آگے بڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

آج نورے کو گھر آئے چھٹا دن تھا لیکن اُس نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ بالے اور طیلے کے ساتھ فلاش کھیلنا تو ایک طرف، ہیرا منڈی کے چوک میں بھی ایک لمحے کو نہیں بیٹھا۔ سب حیران تھے، آخر نورے کو ہو کیا گیا ہے؟ ایسے واقعات تو ہیرا منڈی میں آئے دن ہوتے تھے۔ ایک دفعہ فیضاں نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر نورے کے تیور ایسے لگتے تھے کہ ابھی کاٹ کھائے گا۔

کہنے لگا۔ میرا تجھ سے کیا رشتہ سوائے اس کے کہ میں تیرا دلال ہوں لیکن تیرے باپ کا تو پھر بھی پتا ہے۔ بچاری چُپ سادھ گئی۔ اُدھر شریفن کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ اس سے پہلے اُس نے بیٹے کی بدلی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ بلکہ اب تو اس کے کمرے میں بھی آتی ہوئی ڈرتی۔ دل ہی دل میں دعا کرتی کہ جب تک نورے کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ خدا کرے کوئی گاہک نہ آئے۔ دروازے کو ایسے کنڈی چڑھائے رکھتی جیسے شریفوں کا گھر ہو۔

ساتویں دن صبح ہی، جب شریفن چولہے پر بیٹھی چائے بنا رہی تھی، نورا پاس آ بیٹھا اور آہستہ سے بولا اماں ایک بات بتا۔

شریفن ایک دم خوش ہو کر بولی "ماں صدقے، پوچھ بیٹا کیا بات ہے۔"

نورا اور نزدیک ہو کر بولا "سچ بتا، جس کا نام میرے شناختی کارڈ پر ہے" کیا وہ میرا اصلی باپ ہے؟ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بتا۔

شریفن نورے کی بات سُن کر ہکا بکا رہ گئی

لیکن پھر سنبھل کر نورے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بیٹا، میں لاکھ رنڈی سہی مگر تیرے

ساتھ دھوکا نہیں کیا اور بے بھی تُو نکاح کا۔ تا سولا کھا انکار کرے لیکن ہے وہ تیرا ہی باپ۔ پھر ایک دم حوصلہ پا کر بات بدلتے ہوئے بولی پر "نورے یہ تو بتا تُو اتنے دن غائب کدھر رہا۔"

نورے کے لہجے میں خود اعتمادی لوٹ آئی، کہیں مکان کا سودا کرنے گیا تھا مگر اب یہیں رہیں گے۔

☆☆☆

الیکشن کا رزلٹ ایک کے بعد ایک آنے لگا۔ چھوٹے پولنگ سٹیشن پر تو کب کی گنتی ہو چکی تھی لہٰذا اب مغرب کی اذان سننے کا کسے ہوش تھا۔ احاطے کا صحن سینکڑوں آدمیوں سے بھر گیا اور خوشامدیں ہونے لگیں۔

راؤ صاحب نے پیسا تو پانی کی طرح بہادیا۔ ایک بولا، کسی نے ایک مانگا تو دس دیے۔ خدا قسم ان کمین کے بیس دنوں میں تو کمی کمین نے اپنے گھر کا چولہا نہ جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایک اور شخص نے لقمہ دیا جو راؤ جمیل خاں کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

بھئی اب بھی ووٹ نہ ملتے تو سالی رعایا کا قیمہ نہ بنا دیتے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ پیسے کے علاوہ انسان کی کوئی خاندانی شناخت بھی ہونی چاہیے تاکہ سر اُٹھا کر بات بھی کر سکے۔ چا نہیں پیاز کھانے والے کہاں سے آگئے راؤ صاحب کے مقابلے میں الیکشن لڑنے۔ اب راؤ جمیل خاں نے فخر سے سگار کا گہرا کش لیا۔ دوسری طرف شمیم بھٹی بول اٹھا۔

راؤ صاحب ویسے آپ نے الیکشن میں بڑی گیم ماری ہے۔ چوہدری اعجاز کو دس لاکھ دے کر اپنے چچا ہی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ چوہدریوں کے ووٹ بٹ گئے اور آپ صاف نکل گئے۔ اب آپ تو الیکشن جیتے، وہ الٹا ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں سیاست۔

راؤ جمیل خاں نے اپنی تعریف سن کے پہلو بدلا اور ایک اور گہرا کش لیا۔

میاں سیاست میں خون جلانا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کے گھر میں روشنی ہووے اور بھائی حکومت بچے بھی راجپوتوں کو ہی۔ باقی ذاتاں تو بس کی کمین ہو ویں۔ اُن میں عقل تو ہوتی نہیں، حکومت کیا خاک کریں گے؟

راؤ جمیل خاں کے اس تبصرے پر ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔

رات نو بجے تک قریب قریب رزلٹ سارا آ گیا۔ جس کے مطابق راؤ جمیل خاں

ہزاروں سے جیت رہا تھا۔ اب جو چند پولنگ اسٹیشن رہ گئے تھے، ایک تو اُن کے ووٹوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، دوسرا وہاں بھی راؤ جمیل کی فتح کے واضح اشارے تھے لہٰذا چوہدری شفیع محمد کی شکست یقینی تھی۔

ہر طرف سے مبارکیں وصول ہونے لگیں۔ راؤ صاحب نے آج جو میدان مارا تھا، وہ واقعی پانچ سال کی فتح تھی بلکہ راؤ صاحب نے سوچا کہ اب تو یہ پشت در پشت چلے گی۔

رات کے دس بجے عوام کے ساتھ سرکاری افسران بھی تحفے لے کر آنے لگے۔ تھوڑی دیر میں نوٹوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبوں کا پہاڑ جتنا ڈھیر لگ گیا اور رات ایک بجے راؤ صاحب کی فتح کا مکمل اعلان ہو گیا۔ ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں آنے لگیں۔ راؤ صاحب کی کوٹھی کے سامنے بہت بڑا مجمع تھا۔ کلاشنکوف اور پسٹل کے ہوائی فائر ہونے لگے۔ جسے دیکھتے ہوئے راؤ جمیل نے شوکت خاں کو آواز دی، سوکت خاں، بھاگیو کچہری روڈ سے فیاض قریشی کی دوکان کھلوا کے دس بیس اچار کے روند فوراً لے آئیو۔ کوئی اور گیا تو وہ سُسرا رات کے اس سمے دوکان نہیں کھولے گا۔

رات جوں جوں گزرتی گئی تحفوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ راؤ صاحب نے آنے والے مہمانوں کے لیے جلدی سے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ آناً فاناً پڑوسیوں کی دو تین بھینسیں پکڑ کر حلال کر دی گئیں۔ دیگیں چڑھ گئیں۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں نپٹایا جانے لگا۔ الاؤ روشن ہو گئے۔

جو لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے وہ اب آگ کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ دہکتے کوئلوں کی ایک بڑی انگیٹھی راؤ عبدالجمیل خاں اور پاس بیٹھے ہوئے شرفا کے درمیان رکھ دی گئی۔ حقے کی نے دائرے میں چلنے لگی۔

رات کے پچھلے پہر سردی کافی بڑھ گئی تھی لیکن انگیٹھی سے اٹھتی حرارت اور تازہ فتح کی وجہ سے راؤ عبدالجمیل خاں سرور کے عالم میں بیٹھا تھا۔ چاروں طرف سے گپیں ہانکی جا رہی تھیں اور چائے کے دور چل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دُھند اور کُہر بھی کافی بڑھ گیا کہ نظر دس فٹ سے آگے نہیں جاتی تھی۔ اتنے میں ایک شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ راؤ جمیل خاں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو نورا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی، پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ غالباً اُس کے سر پر رکھی ہوئی بوری کافی وزنی تھی۔ پاس آ کر نورے نے بوری اپنے سر سے اُتار کر راؤ جمیل خاں کے قدموں میں رکھ دی اور اُسے الیکشن میں کامیابی کی مبارکباد دینے لگا۔

"راؤ صاحب میں نے سوچا، میں بھی آپ کو مبارک دے آؤں اور یہ تحفہ (بوری کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ نوٹوں کے ہار اور مٹھائی تو آنی جانی شے ہے لیکن جیسی شاندار آپ نے آج کامیابی حاصل کی ہے، ویسا ہی تحفہ بھی ہو یہ کہہ کر اس نے بوری کھول دیا، جسے دیکھ کر راؤ جمیل اور دوسرے تمام لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔

بوری میں راؤ شوکت خاں کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے، جن میں سب سے بڑا ٹکڑا سر کا تھا۔

راؤ صاحب" نورا پھر بولا" میں نے سوچا آپ شریف آدمی ہیں۔ یہ شوکت خاں آپ کو ذلیل کرے گا۔ آج پھر یہ فیضاں کے پاس چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک اور نورا یا فیضاں پیدا ہو جاتی۔ ادھر آپ راجپوت ہیں۔

راؤ جمیل خاں کو ایسے لگا، جیسے یہ آواز کسی گہرے کنویں سے سُن رہا ہو۔

قائم دین

ہاں تو بول اس ڈبے کھری کا کیا لے گا؟ ویسے ایک بات کہوں؟ چوری کا مال ہے، سوچ کے مول لگانا۔ کل کلاں پلس آ گئی تو اس کے ساتھ بھی ٹنک مکا کرنا پڑے گا۔

نور دین نے بھینس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دیکھ میاں نورے، پانچ ہزار سے ایک ٹکا نیچے نہیں لوں گا۔ اٹھارہ لیٹر دودھ سویرے شام باٹوں سے تول لینا۔ قطرہ کم ہوا تو تھڑے پر موچھ منڈوا دوں گا۔ رہی پلس کی بات! اگر تجھے کوئی پوچھے، سید حا میرے چھپر کی راہ دکھانا، میں جانوں اور پلس۔ قمے نے صاف روکھے پن سے مول بتاتے ہوئے کہا۔

پانچ ہزار، قہر خدا کا آخر بھینس ہی تو ہے، کوئی ہاتھی تھوڑی ہے۔ پھر تم کون سا مول لے کے آئے ہو۔ مفت کی مار ہے۔ تین ہزار لو اور کمبل سے جان چھڑاؤ۔ مائی نذیراں کو تو پچھلے مہینے بیل برابر گائے ایک ہزار ہی میں دے دی اور مجھ سے پانچ ہزار مانگتے ہو۔

اے چل، مفت کی مار ہے۔ بارڈر پار سے مال چوری کر کے لانا تو ایک طرف، ذرا آدھی رات کو دریا پار کر کے ہی دکھا دے۔ ایسی تین بھینسیں مفت میں نہ دوں تو نظام دین کا نطفہ نہیں۔ قما تلخی سے بولا، پوہ کی ٹھنڈی راتوں کو چڑھتا ستلج پار کر کے ڈیلے کے جنگلوں میں کالے سانپوں کی سریاں پاؤں سے کچلتا اماں جی کا کھیل نہیں۔ پھر بارڈر پار یہ مال سکھوں نے کوئی ہتھیلی پر رکھ کر نہیں کھڑے ہوتے۔ موت کے منہ سے نکال کے لاتا ہوں اور تجھے مفت میں دے دوں؟ اگر پانچ میں لینی ہے تو لے، ورنہ اپنا رستہ ناپ، مائی نذیراں کا تجھے ٹھیک ہے کیا؟ بچاری کا آگا نہ پیچھا، اکیلا دم۔ میں اُسے مفت میں دوں یا پیسے لوں، تجھے کیا درد؟

قے کی بات سن کر نور دین کھسیانا سا منہ لے کر باڑے سے باہر نکل آیا۔ ادھر قے نے جلدی سے بھینسوں کو ٹرک پر لادنے کی تیاری کی، جو اس کا بھائی جلال دین رات ہی منڈی احمد آباد سے کرایے پر لایا تھا۔ اس میں چھ بھینسیں اور دو گائے لاد کر لاکھپور کی منڈی لے گیا۔

اُدھر جلال دین مال لے کر چلا اِدھر قصہ خوانیاں شروع ہو گئیں بھائی شادے خاں، قے نے مونچھ پہ ہاتھ پھیر کر حقے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا، جب میں دریا کے کنارے پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ رات گھُپ اندھیری ایسی کہ عزرائیل بچارے کے بھی ساہ نکل جائیں۔ اُدھر ستلج کا ٹھاٹھیں مارتا ٹھنڈا پانی۔ میں نے دل میں کہا، لے بھئی قیا، تیرا رب راکھا اور سائیں چانن شاہ تیرا امدادگار۔ ماردے چھلانگ دریا میں۔ بس پھر ایک دو منٹ ٹھنڈ لگی، اس کے بعد تو میں دریا سے چیرتا ہوا گزرا۔ پندرہ منٹ میں رب سائیں کے کرم سے اگلے کنارے پر تھا" "اور ڈیلے کا جنگل کیسے پار کیا؟ وہاں تو گلہریوں کی طرح سانپ ناچتے ہیں۔" حشمت علی نے حیرانی سے پوچھا۔

قے خاں، ڈیلے کا نہیں، سانپوں کا جنگل کہو، سانپوں کا۔ قا میٹھی دھوپ میں انگڑائی لیتے ہوئے بولا، اتنے موٹے ہیں کہ بندے کو ثبوتا کھا جائیں، ڈکار لینا تو الگ بات، زبان تک نہیں چاٹتے، بس دو کروٹیں لیں بندہ ہضم۔ قسم چانن شاہ کی ان آنکھوں نے بیسیوں بندے ڈیلے کے اس جنگل میں غائب ہوتے دیکھے۔ دو چار تو میرے سامنے نگلے گئے۔ اب میں کوئی بچہ تھا؟ جو اس کا توڑ نہ جانتا۔ پیر نظام بخش سے منتر اسی اوکھت کے لئے تو سیکھا۔ بس بھائی ادھر میں نے منتر پڑھا، اُدھر باشک ناگ، کل ساڑ، ارگن ناگ، پدم ناگ، کھپرا، گلوڑیا، سنگچوڑ، کلمبریا ایک ایک کر کے سلامی کو حاضر ہوئے۔ نیل بانیا منکر ہوا تو ایک پھونک مار کے دھواں کر دیا۔

لیکن سوروں پر تو منتر چلتے نہیں اور میں جانتا ہوں، دس بیس نہیں، سینکڑوں سور اس جنگل میں ہیں۔ گویا ہندوستانی فوج کتاریں منہ میں دبائے پھرتی ہو۔ ان سے کیسے بچی؟ حامدی نے لقمہ دیا۔

واہ حامدی واہ، یہ تو نے خوب کہی، یہ دیوار سے لگی چھ پھلی برچھی کو دیکھو، کاٹتے وقت دشمن اور سور میں فرق نہیں کرتی۔ پندرہ سور کاٹ کے دیکھ کتنے آرام سے لیٹی ہے۔ جنم جنم کی ساتھی۔ بھاگ بھری نے رات کمال کر دیا۔

قصہ مختصر، قے نے داستان آگے بڑھاتے ہوئے کہا سوروں کو پھاڑتا اور سانپوں کو کچلتا

ہوا، رات ایک بجے بھیجا سینڈوں کی بھینی پر پہنچا اور ایک ایک کر کے ساری بھینسیں کھول کر آگے کر لیں۔ مونجی کے کھیت سے ہوتے ہوئے ایک گھنٹے میں بارڈر سے ادھر لے آیا۔

تو کیا سکھڑوا افیم کھا کے سویا تھا جو جاگا نہیں؟ ارشاد علی نے پوچھا۔

سالا آدمی کہاں؟ بھینس ہے، روزانہ چار جگ لسی پی کے سوتا ہے۔ جو اتنی لسی پی لے، پھر وہ تو کیا اس کے نصیب بھی سو جاتے ہیں۔ فتا سردیوں کی اس روشن دھوپ میں تھڑے پر بیٹھا گاؤں کے لوگوں کو اپنی اس واردات کے قصے سنا رہا تھا کہ دور سے مولوی سراج دین تسبیح پھیرتا ہوا قریب آیا اور فتے کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ فتے مالِ غنیمت مبارک ہو۔ سنا ہے رات اللہ نے تیری بڑی مدد کی۔ پورے آٹھ مویشی لایا ہے۔ بس کافروں کے ساتھ جہاد کا آج کل یہی طریقہ ٹھیک ہے۔ اللہ نے چاہا تو تیری بخشش یقینی ہے۔

تمام لوگوں نے مولوی کی اس بات کو غور سے سنا اور فتے کی طرف رشک سے دیکھا۔ کرتا بھی فخر سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور مصنوعی عاجزی سے مولوی کی طرف جھکا۔ پھر مولوی صاحب نے پندرہ بیس منٹ اسلام اور کفر پر واعظ کہا۔ اس کے بعد فتے کے گھر سے تمام لوگوں کے لئے چائے بن کر آ گئی۔ جسے سب مزے سے پینے لگے۔ چائے پینے کے بعد مولوی سراج دین اُٹھ کر جانے لگا تو سب کھڑے ہو گئے۔ دو قدم چل کر مولوی صاحب پھر مڑ کے اور فتے کو مخاطب کر کے بولے اوئے فتے، مسجد کا حصہ جلدی بھیج دینا، کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے۔

بس مولوی صاحب جلال دین منڈی سے واپس آ جائے تو سب سے پہلے مسجد کا حصہ آئے گا۔ فتے نے تڑ سے جواب دیا۔

لے بھئی فتے آج سے تیسرے روز بھادوں کی سولہ ہے۔ خانو سیال نے بیٹھتے ہوئے کہا، میں نے تجھ پر دو ہزار کی جھنڈی رکھ دی۔ حیدا گجر اس دفعہ کشتی میں جیت کے نہ جائے۔ شام دین اور فیضے نے اُس پر شرط لگائی ہے۔

چاچا خانو، تُو فکر نہ کر، حرامی کو ایسا دھوبی پٹڑا دوں گا کہ آئندہ دس پشتوں تک کوئی کشتی نہ کھیلے گا۔ گینڈے کی اولاد نے پچھلے سال مائی جمن کے پتر کی ٹانگ توڑ دی اور پسلیوں پر بھی بلاوجہ زور دیتا رہا۔ فتا بولا، وہ تو کھو سردار نبی بخش نے کشتی چھڑا دی ورنہ تو یہ اس کو مارنے ہی لگا تھا مگر یہ تو

چاچا کر اتنے پیسے کہاں سے آ گئے؟ جو پورے دو ہزار لگا رہے ہو۔ پھر کتوں کی لڑائی اور کبڈی پر بھی تو شرطیں بند ھنا ہیں۔

پھر تو اس کی پروا نہ کر۔ خانو سیال بولا، اس دفعہ گنے اور مونجی کی فصل نے سارے دلدر دور کر دیے۔ پورے ایک لاکھ کی فصل ہوئی۔ قرضہ ورضہ دے کر بیس ہزار اس کڑے وقت کے لئے بچا رکھا ہے۔ لیکن اس سال تو نے بھی تو تین چوریاں کیں، وہ کیا ہوئیں؟ جہاں تک مجھے پتا ہے، کم سے کم ڈیڑھ لاکھ کا مال ہوگا۔ جانو، شریفا، شتا اور کالو نائی تو اسی کام میں لاکھوں کے مالک بن گئے اور تو وہی پھاتنگ کا پھاتنگ۔

چاچا کیا بتاؤں، قتا تاسف سے بولا۔ جس دن چوری کر کے لاتا ہوں، دوسرے دن ہی آدھا گاؤں ادھار لینے آ جاتا ہے اور آج تک کسی نے ایک پائی واپس نہیں کی۔ پولیس تیسرا حصہ الگ مار لیتی ہے۔ اس کے علاوہ چندرہ لوگ گھر کے اور اللہ بخشے بھائی رحمت کا کنبہ الگ۔ بس سمجھو ادھر آیا اور ادھر نکل گیا۔ خیر چاچا اس قصے کو چھوڑ۔ اس دو ہزار میں سے ایک ہزار میرا اور باقی کا تیرا۔ اللہ نے چاہا تو سولہ بھادوں کو چاتن شاہ کا میلہ رنگ دوں گا۔

میلے میں ابھی تین دن تھے چک قاسم شاہ اور اردگرد کے دس پندرہ گاؤں جو دریا کی اٹھاڑ میں پڑتے تھے، سب میلے کے علاوہ ہر چیز بھول گئے۔ پہلوانوں کو مالشیں ہو رہی ہیں۔ کتوں اور مرغوں کی خدمتیں دگنی ہو گئیں۔ چاتن شاہ کے مزار کے دائیں پہلو دریا کے کنارے اکھاڑے کی جگہ ہل چلا کر خوب نرم کر دی گئی۔ مزار پر جھنڈیاں اور رنگ برنگے دوپٹے لہرانے لگے۔ دور دور سے گاؤں کی عورتیں مزار پر گھی کے چراغ جلانے آئیں اور منتوں کا دودھ تقسیم ہونے لگا۔ ملنگوں نے بوٹی کے رگڑے اور حق علی کے نعرے اور تیز کر دیے۔ توت اور نیم کے گھنے سایوں میں دھمالیں پڑیں تو اٹھاڑ میں گویا زندگی جاگ اٹھی۔ بچوں سے بوڑھوں تک ہر کوئی مزار کی طرف رواں ہوا۔ مزار کے اردگرد کے بیسیوں ایکڑ زمین مٹھائی، جلیبی اور پکوڑوں والوں کی دکانوں سے بھر گئی۔

چندرہ کی رات دربار پر ہر طرف سے گھی، گیس اور تیل کے چراغ جل اٹھے۔ نقالوں بھانڈوں کی ٹولیوں نے اپنے اکھاڑوں کے لئے الگ الگ جگہوں پر قبضے جمائے اور آدھی رات

تک تیاریوں میں مصروف رہے۔ چاند کی چودھویں کا دودھ برس رہا تھا اور خوشی کا میلہ تھا کہ شفیع کمبوہ نے خبر دی، دریا کا پانی معمول کی سطح سے بلند ہو رہا ہے۔ اپنا اپنا بندوبست کر لو۔ اچانک لوگوں میں اضطراب پھیل گیا۔

رفیق جوئیہ گھر سے ریڈیو اُٹھا لایا۔ آٹھ دس دن سے وہ یہ خبر سن تو رہے تھے کہ دریا کا پانی چڑھنے والا ہے مگر وہ اسے افواہ ہی سمجھے۔ کیونکہ ہر سال ایسی افواہیں اُڑتی تھیں لیکن پانی کبھی بھی خطرے کی حد تک نہ چڑھا۔ ہاں، بیس سال پہلے ایک سیلاب آیا تھا، جس نے ان کا کافی نقصان کیا پھر اُس کے بعد ایسی کوئی مصیبت نہ آئی۔

رات ایک بجے تمام لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھ گئے اور خبروں میں سیلاب کے بارے میں سننے کے لئے تیار ہوئے مگر تمام خبروں میں سیلاب کا ذکر تک نہ تھا۔ پھر بھی بے چینی نہ گئی۔ حتیٰ کہ لوگ میلے کو بھول کر دریا کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ پانی کی آواز دور تک سنائی دینے لگی۔ تقریباً تین بجے رات تک دریا نے اپنے پہلے کنارے ڈبو دیئے اور فصلیں چاٹنے لگا۔ اب تو خوف وہراس ایسا پھیلا کہ خلقت میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ ہی دیر میں پانی جب مزار کے قریب آ گیا تو دکانوں والوں نے جلدی جلدی دکانیں بڑھائیں۔ نقال اور بھانڈ اکھاڑے سمیٹنے لگے اور لوگ اپنے اپنے گاؤں کی طرف بھاگے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے دریا گاؤں کی کچی دیواریں کھا چکا تھا۔

رات کے سے لوگ جو کچھ سمیٹ سکے، اسے سمیٹا باقی وہیں چھوڑ کر بڑے بند کی طرف جانے لگے۔ ٹرالیاں، چھکڑے اور گدھی ریڑیاں جُت گئیں مگر دریا کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ تیز و تند شور اُٹھاتا دریا فیلِ مست کی طرح چڑھا آتا تھا۔ فتے نے دیکھا تو اس نے اپنی بھینسوں اور کنبے کے علاوہ ہر شے وہیں چھوڑ دی اور انہیں ہانکتا ہوا بڑے بند کی طرف بڑھنے لگا۔

صبح پانچ بجے تھا اور دریا برابر بند پر پہنچے۔ بند پر فتے کی طرح اور بھی سینکڑوں لوگ دور دور تک کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے عاقبت اندیشی سے کام لے کر جلدی اِنخلا چھوڑ دی تھی۔ فتے نے کنارے پر کھڑے ہو کر جب دریا کو دیکھا تو اسے ایسے لگا جیسے زمین کے اندر سے پانی کا بڑا اژدھا نکل آیا ہو۔

ہزاروں چھپر بہے چلے جاتے تھے۔ سینکڑوں بکریاں اور گائے بھینسیں تیرتی اور ڈوبتی ڈباتی بند کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ارشاد علی پر پڑی جو اپنے دو بچوں

اور بیوی کو بمشکل سنبھالے، ہانپتا ہوا بند کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تُمّے نے جیسے ہی دیکھا، چھلانگ لگا کر چیتے کی سی پھرتی سے ارشاد علی کے پاس پہنچ گیا اور دونوں بچے اُچک کر بند کی طرف بڑھا۔ ارشاد علی کی جان میں جان آئی لیکن اب تُمّے کو چین کہاں ادھر ادھر سے ڈوبتوں نے پکارنا شروع کر دیا اور یہ، دریا سے بند پر اور بند سے دریا میں کئی چکر لگا دیے۔ بیسیوں کو کھینچ کھینچ کے باہر لایا۔ مولوی سراج دین، چوہدری نور دین، فیض چوہدری، خان سیال اور سینکڑوں گاؤں والے بند پر بیٹھے لاچاری کے عالم میں، مکئی، گیہوں اور باجرے کے غلوں کو پانی میں تیرتے دیکھ رہے تھے۔ اب دریا کا پانی اتنا بلند تھا کہ بند کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ بڑے بڑے درختوں کی چوٹیاں ڈوبنے سے بچ گئیں، جو پرندوں سے ڈھکی پڑی تھیں۔ دریا نے کئی درخت بھی جڑ سے اکھیڑ دیئے۔ ہزاروں مویشی ڈوب گئے، جنہیں پانی بہائے لئے جاتا تھا۔ اِکا دُکا انسانوں کی لاشیں بھی تیرتی نظر آئیں اور دریا کا پاٹ میلوں تک پھیل گیا۔ ایسی حالت میں تُمّے نے دوپہر ڈھلتے تک اپنی ڈوبی ہوئی بستی سے بند پر خدا جانے کتنے چکر لگائے اور تھک کر نڈھال ہو گیا۔ اس کے باوجود ہر ایک کی نظر مدد کے لئے اسی پر پڑتی اور وہ ہر چکر میں بند پر پہنچ کر ایک تفاخرانہ انداز سے لوگوں پر نظر ڈالتا جیسے کہہ رہا ہو دیکھا! میں جو تم کو اپنے کارنامے گنواتا تھا، اب تو ان پر یقین آیا کہ نہیں؟ میرے علاوہ آج کون دریا کا سامنا کرنے والا ہے؟ ایسی نظر مار کر دوبارہ کسی مہم کے لئے بپھرے ہوئے پانی میں چھلانگ لگا دیتا لیکن انسان آخر انسان ہے۔ دوپہر تک تھک کر نڈھال ہو گیا۔ بیوی نے یہ حالت دیکھی تو روکنے لگی کہ اب نہ کودنا۔ آہستہ آہستہ اس کا اپنا جوش بھی کافی ٹھنڈا پڑ گیا مگر وہ یہ سوچ کر کہ لوگ اسے نامردی کا طعنہ دیں گے، دوبارہ پانی میں کود جاتا۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہو گئی پھر اچانک یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ لوگوں کی مدد کے لئے پاک فوج دریا میں اتر آئی ہے۔ اب اس نے جلدی سے اپنے قبیلے کو لیا اور "چک جھنڈا"، میں فوج کے لگائے ہوئے خیموں میں سے ایک خیمے میں جا بیٹھا۔ پھر ایسا سویا کہ دوسرے دن دوپہر ہونے پر آنکھ کھلی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور بند کی طرف بھاگا۔ دیکھا تو ہر طرف سکون تھا۔ رات تک ہر چیز یا تو ڈوب گئی یا بہہ چکی تھی۔ جدھر نظر جاتی سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آیا۔ پانی پر اُڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرندے قلابازیاں لگا رہے تھے، جیسے اجاڑ کی بربادی پر خوشیاں مناتے ہوں۔ انہیں دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ اس کے آنسو نکلے۔ وہ شام تک بند پر کھڑا رہا۔ آج وہ اس قدر بوجھل تھا کہ کچھ بھی ہو جاتا، پانی

میں داخل نہ ہوتا۔ سورج ڈوبنے لگا تو تُمّے کو محسوس ہوا کہ اسے شدت سے بھوک لگی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس نے تو پرسوں شام سے کچھ نہیں کھایا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف لوٹ گیا۔ اس کے بعد تو گویا اس کا معمول بن گیا۔ روزانہ صبح بند پر آ کر بیٹھ جاتا اور میلوں پر پھیلے ہوئے دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہتا اور شام کے بعد خیمے کی طرف لوٹ جاتا۔ ساتویں روز اس نے دیکھا، پانی اپنی سطح سے نیچے اُتر رہا ہے۔ پہلے دو دن تو آہستہ آہستہ، پھر اُس پھرتیزی سے سمٹنے لگا اور ہر روز تقریباً دو فٹ نیچے چلا جاتا۔ غالباً بیس دن کے اندر اندر دریا کا پانی اپنے پہلے کناروں میں سمٹ گیا لیکن زمین میں نمی اور کیچڑ اس قدر تھا کہ لوگوں کا آباد ہونا ابھی ناممکن تھا۔ جگہ جگہ تالاب بن گئے۔ ادھر ادھر مردہ جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ جنہیں سارا دن گدھیں اور کوّے نوچتے رہتے۔ سینکڑوں درخت زمین پر لیٹے تھے، جن میں کوڑا کرکٹ پھنسا ہوا تھا۔ اسی حالت میں سیلاب کے بعد دو ماہ گزر گئے۔ ادھر لوگ خیموں کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلدی سے اپنے اُجاڑ میں جا بسیں مگر جدھر دیکھتے، گڑھوں میں کھڑے پانی سے تعفن اُٹھ رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کی جھاڑیاں اُگ آئیں جن کی اوٹوں میں ہزار ہا بلیات نے جنم لے لیا۔ کیڑے مکوڑوں اور سانپوں کی بہتات ہو گئی۔ اس عالم میں خیمے سے نکلنے والا پہلا شخص تُمّا تھا۔ جو اپنی بستی کیلئے بے چین تھا۔ اس کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

تُمّے نے جیسے ہی دریا بُرد گھر میں قدم رکھا۔ اس کے جسم میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ تمام گھر والوں کو ساتھ لیا، کیچڑ اور مٹی گارے سے دیوار بنانی شروع کی۔ اُسے دیکھتے ہوئے سارا گاؤں حوصلے میں آ گیا۔ حتیٰ کہ دو مہینے میں بستی دوبارہ بس گئی۔ زمین آہستہ آہستہ تعفن اور غلاظت نگلنے لگی۔ لوگوں نے مردہ ہڈیاں اور انجر پنجر دفن کر دیے۔ اپنی اپنی زمینوں کی دوبارہ حد بندیاں کی گئیں اور چھ ماہ کے اندر ہی ہل پھر چلنے لگے۔ بستی کے بہت سے درخت اُکھڑ چکے تھے۔ لوگوں نے سائے کے لئے اپنے اپنے گھروں میں دوبارہ پودے لگا دیے۔ تُمّے کے گھر میں بھی تین کیکر اور ایک بیری کا درخت تھا۔ جس پر سارا دن کوّے اور چڑیاں شور مچاتے۔ اُن کی آواز کانوں میں ایک قسم کا رس گھولتی تھی۔ سیلاب اُن درختوں کو بھی بہا کر لے گیا۔ لہٰذا تُمّے نے بھی بند کے اوتاڑ سے ایک بیری کا پودا لا کر گھر میں لگا دیا۔ جو دریا کی زرخیز زمین میں خوب پنپنے لگا۔ دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ دو سال بعد تو ایسے ہو گیا، جیسے سیلاب کبھی آیا ہی نہ ہو۔ تُمّے نے دوبارہ اپنا کاروبار

شروع کر دیا۔

اب دریا کے پار کا آٹھ کلو میٹر میں پھیلا ہوا ڈیلے کا جنگل پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور گھناؤنا ہو چکا تھا۔ جنگل میں پانی جو کبھی ٹخنوں کے برابر تھا وہ گھٹنوں گھٹنوں ہو گیا۔ بچھو، سانپ، نیولے اور نہ جانے کون کون سے حشرات الارض رینگتے پھرتے۔ کئی اژدھے لوٹیں مارتے، گیدڑوں، سوروں کی گڑ گڑاہٹیں، الوؤں اور چڑیلوں کا شور کانوں کی سماعت چھین لیتا۔ ایسی خوفناک صورت حال میں آدمی رات تو کیا دن کو بھی وہاں سے نہیں گزرتا تھا۔ مگر تے کے لئے یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس نے جنگل میں کئی ایک جگہیں اپنے ٹھکانے کے لئے بنائی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ جنگل کی اونچ نیچ سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون سی جگہ زیادہ خطرناک ہے اور کون سی کم۔ اگر کوئی بلا سے واسطہ پڑے تو کیسے بچاؤ کرتا ہے؟ وہ اپنے پاس آگ کا بندوبست ضرور رکھتا۔ اُسے آگ نے کئی دفعہ خطرناک صورت حال سے نکالا تھا۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی تما دریا پار کر کے ڈیلے کے جنگل میں آجاتا اور بیچوں بیچ آٹھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ جاتا۔ رات کے پچھلے پہر بارڈر کراس کر کے گائے، بھینس، بیل یا بھیڑ بکریاں جو کچھ ہاتھ لگتا ہانک کر ڈیلے کے اسی جنگل سے ہوتا ہوا دریا پر آتا اور صبح دس بجے سے پہلے اپنے گاؤں پہنچ جاتا۔ تما ہر چوری میں کم از کم دو ماہ کا وقفہ ضرور رکھتا۔ ہندوستانی رینجر سے کئی دفعہ پاکستانی رینجر کو شکایات بھی وصول ہوئیں لیکن ڈیلے کا جنگل دونوں کے لئے مشکل پیدا کئے ہوئے تھا۔ جب کہ تے کے لیے وہی جنگل نعمت تھا۔ سیلاب کے بعد دس سال گزر گئے اس عرصے میں تے نے خدا جانے کتنے لمبے ہاتھ مارے۔ اس نے اپنے گاؤں کو مویشیوں سے بھر دیا۔ سیلاب میں غارت ہونے والے کئی لوگوں کے چولہے مفت میں جلائے۔ بہت سوں کو سستے داموں بیچتا رہا۔

پہلے پہل تو پاکستانی رینجر اسے نظر انداز کرتی رہی لیکن اب صورت حال زیادہ بگڑ گئی تھی کیونکہ ہندوستانی رینجر کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا پاک رینجر نے سنجیدگی سے چوروں کو پکڑنے کے بارے میں سوچا۔ دریا سمیت ڈیلے کے جنگل کی خفیہ ناکہ بندی کر دی گئی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے گئے، جس میں پہلے مہینے ہی شتا اور کالو پکڑے گئے لیکن تما ہاتھ نہ آیا۔ اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ چوری کرنے سے پہلے پورے علاقے کی جاسوسی کرتا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ اس نے اپنے والد کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہت سے تجربات حاصل کئے

تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کس طرح مشکل حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ باپ نے اسے بہت سے گر بتائے تھے۔ لہٰذا اس سال اس نے صرف دو کامیاب چوریاں کیں۔

دوسری چوری اس نے دسمبر کی انتہائی سرد رات میں کی جس میں وہ پوری گیارہ بھینسیں ہندوستانی علاقے سے تین کلو میٹر اندر جا کر لے آیا تھا۔ یہ چوری ایسی نہ تھی کہ جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ دو طرفہ رینجرز میں ایک بھونچال آ گیا۔ اور افسران بالا سے انتہائی سرزنش ہوئی۔ ان حالات میں رینجرز نے اپنی سرگرمیاں انتہائی سخت اور تیز کر دیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ مال جنگل سے ہو کے نکلتا۔ پھر بھی رینجرز نے تہیہ کر لیا، چاہے کچھ بھی ہو اب چور ضرور پکڑا جائے، مخبر تیار کئے گئے اور مکمل بندوبست انتہائی خفیہ طریقے سے کیا۔

چندرہ فروری کی سہ پہر تھا دریا پر پہنچا تو اسے ارشاد علی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ تھے کے ہاتھ میں پھجوی دیکھ کر ارشاد مسکرایا اور دور ہی سے ہاتھ ہلا کر گاؤں کی طرف مڑ گیا۔ تھے نے سوچا ارشاد کتنا حرامی ہے، میری دو بھینسوں کے پیسے کھا گیا۔ چھ ماہ ہو گئے ایک ٹکا نہیں دیا۔ اب نزدیک آ کر سلام لینے سے بھی گیا۔ اس نے سوچا اب میں سارا مال منڈی میں ہی بھیجا کروں گا۔ گاؤں والوں کو کسی جانور کی دُم بھی نہیں دوں گا۔ اتنے مشکل حالات میں موت کے منہ سے جانور نکال کر لاتا ہوں اور یہ گاؤں والے بیٹھے بٹھائے مفت میں لے جاتے ہیں۔ خبیث بعد میں پیسے بھی نہیں دیتے۔

رات دو بجے تھا جیسے ہی ڈیلے کے جنگل سے نکلا اور ہندوستان میں داخل ہونے لگا پاک رینجر نے اچانک دبوچ لیا۔ تھے کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ جنگل میں دوبارہ داخل ہو جائے۔ وہ حیران ہوا کہ انہیں کیسے پتہ چلا۔ اسی تذبذب میں تھا کہ اس کی مشکیں کس دی گئیں اور رینجر ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر مار پیٹ شروع کر دی۔ تھے نے اپنی زبان ایسی بند کی کہ رینجر کا ہر طریقہ فیل ہو گیا۔ دو مہینے تک تھے کو اتنی مار پڑی کہ زمین ہل جاتی تھی۔ روزانہ مار کھانے کے بعد تھا مسلسل سوچتا، آخر اس کی مخبری کرنے والا ہے کون؟ چھ ماہ تک رینجر نے تھے سے اگلوانے کا ہر حربہ استعمال کیا۔ شلوار میں چوہے چھوڑے گئے، اُلٹا لٹکایا گیا، پانی میں غوطے دیے۔ اور مار تو اتنی دی کہ خود رینجر والوں کو اس پر ترس آنے لگا۔ جب وہ کسی طرح بھی نہ مانا تو شراب کا

کیس بنا کر اسے منڈی احمد آباد تھانے بھیج دیا لیکن ان چھ ماہ کے دوران قما جسمانی اور دماغی طور پر بالکل نڈھال ہو چکا تھا کیونکہ رینجر کے خوف سے ایک تو گاؤں میں سے کسی نے آ کر اس کی خبر نہ لی اور دوسرا یہ کہ اُس کا بھائی جلال دین رینجر کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے چار ماہ پہلے مر گیا۔ اُسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ قمے کو منڈی احمد آباد تھانے میں چھ ماہ تک رکھا گیا اور ہلکی پھلکی دوائیاں بھی دیتے رہے مگر بخار نہ اُترا۔ آخر ایک دن تھانے دار نے اُسے بلایا اور تھوڑی بہت سرزنش کر کے چھوڑ دیا۔

حوالات سے نکلتے ہی اُس نے ہلکی سی انگڑائی لی اور تھوڑی دیر کے لئے تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ کیکر کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی۔ اُس کے اوپر کوئی کپڑا بھی نہ تھا۔ ہوا کی ایک سرد لہر اُس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ منڈی احمد آباد کے تھانے سے اس کا گاؤں بائیس کلو میٹرز دور تھا۔ اُس نے باجرے کے کھیت کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ بخار سردی کی وجہ سے زیادہ تیز ہوتا چلا گیا اور سر میں شدید درد بھی ہونے لگا لیکن وہ چلتا گیا۔ رات ایک بجے کے قریب اُسے ایک چکر سا آیا اور وہ گر پڑا۔

صبح سات بجے شریف حسین نے قمے کے بیٹے طفیل کو بتایا کہ تیرا باپ خربوزوں کے کھیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اُسے ہوش میں لایا تو وہ اس وقت سے پکھا اُلٹی سیدھی مار رہا ہے۔ اُس نے ہمیں پہچانا بھی نہیں۔ خدا خیر کرے مجھے تو لگتا ہے کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ اُسے بہت تیز بخار بھی ہے۔ شاید بخار اُس کے سر کو چڑھ گیا ہے۔

یہ 1998ء کی بات ہے۔ قمے کو پاگل ہوئے اٹھارہ سال ہو گئے۔ شروع شروع میں تو بہت علاج کرایا۔ گاؤں کے حکیم کے دیسی نسخوں سے لے کر پیر چراغ شاہ کے تعویذ آزمائے مگر پاگل پن بڑھتا ہی گیا۔ اس عرصے میں وہ کبھی تندرست بھی ہو جاتا مگر یہ حالت چند دنوں سے زیادہ نہ رہتی۔ پچھلے دس سال سے تو وہ ایک لمحے کے لئے بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اب اُس نے گاؤں والوں کو گالیاں بھی دینا شروع کر دیں۔ جو سامنے سے گزرتا اسے بیہودہ گالیاں دیتا۔ رفتہ رفتہ حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ لوگوں کو ڈھیلے اُٹھا کر مارنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگ اُس سے کترا کر گزرنے لگے۔ ادھر یہ اُن کی اس حرکت سے مزید اشتعال میں آ کر گالیاں دیتا ہوا پیچھے بھاگنے لگا

جسے لوگوں نے کچھ عرصہ تو برداشت کیا مگر اب وہ تنگ آ گئے اور تمے کے بیٹے کو شکایتیں آنے لگیں۔ جب شکایات شدت اختیار کر گئیں تو ایک دن طفیل نے قائم دین کو ایک چھوٹی سی زنجیر سے اُسی کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تاکہ گھر سے نہ نکلے۔ قائم دین دو تین دن تو اسی حالت میں رہا مگر ایک رات چارپائی سمیت باہر نکل کر گاؤں کے چوک میں بیٹھ گیا اور وہی گالیاں دینے لگا۔ یہ دیکھ کر طفیل نے اُس کی چارپائی گھر میں کھڑے بیری کے درخت سے باندھ دی۔ اب قائم دین گھر کے افراد کو سارا سارا دن کوستا اور زنجیر پٹختا رہتا۔ یوں دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن خدا جانے کیسے زنجیر ٹوٹی اور قائم دین آزاد ہو گیا۔ قدرت خدا کی، طفیل گھر پر نہیں تھا۔ عورتوں سے پکڑا نہ گیا، وحشت عروج پر تھی۔ شام تک کئی ایک کو زخمی کر دیا اور بہت سوں کو بیہودہ گالیاں دیں۔ گاؤں میں بہت ہنگامہ ہوا۔ کم بخت نے ارشاد علی کی بیٹی کو تو ایسی اینٹ ماری، بیچاری سیدھی ہسپتال جا پہنچی۔ دوئم، مسجد میں گھس کر تمام نمازیوں کے سروں پر خاک ڈال دی اور جوتے اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیے۔ اُس کی اس حرکت سے طفیل عتاب میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے بُرا بھلا کہا۔ چوہدری عاشق علی نے طفیل کو بلا کر کہہ دیا، اگر تمہارے باپ نے آئندہ ایسی حرکت کی تو گاؤں سے اپنا بستر گول کر جانا۔ بڈھے نے بیس سال سے سب کو پاگل بنا رکھا ہے۔ یا تو اسے باندھ کے رکھو ورنہ زہر دے کر قصہ پاک کرو تاکہ روز کی چخ چخ سے جان چھوٹے۔ لہٰذا طفیل نے قائم دین کو اب جو زنجیر مارا وہ ایک مست ہاتھی کے لئے بھی کافی تھا۔ اُس نے آتے ہی لوہار سے پندرہ کلو کا ایک لوہے کا زنجیر اور دو کلو کا دیسی تالا بنوا کر قائم دین کو بیری کے موٹے تنے سے باندھ دیا۔ پاس ایک چارپائی رکھ دی۔ کہ چاہے تو چارپائی پر لیٹ جایا کرے، ورنہ زمین تو ہے ہی۔

قائم دین کی بہو صبح و شام کھانا اُس کے سامنے رکھ دیتی کہ وہ سگی بھتیجی بھی تھی کوئی اور نزدیک جاتا تو وہ کھانا بالکل نہ کھاتا تھا۔ قائم دین کو اس زنجیر سے بندھے آج چھ ماہ ہو چکے تھے۔ بائیں ٹخنے پر گہرے زخم واضح دکھائی دینے لگے۔ پچھلے چھ ماہ سے بہو برابر اُس کا صبح و شام گند بھی صاف کرتی۔ یہ اُس کے معمول میں شامل تھا۔

پچھلے اکیس برسوں میں بیری کا درخت اس قدر پھیل گیا کہ پورے احاطے کو اپنے گھیرے میں لے آیا۔ ہری بھری لچکیلی شاخوں پر گلہریاں اور طوطے چڑیاں چہکتیں رہتیں۔ بعض

اوقات قائم دین کے سر پر بھی آ کر بیٹھ جاتیں اور چوں چوں کا شور اس قدر بلند کرتیں کہ قائم دین کی پوری توجہ ادھر ہو جاتی۔ اب وہ سارا سارا دن بیری کی شاخوں پر بھدکتی گلہریوں، رس چوستی شہد کی مکھیوں اور ہرے پتوں کے درمیان چہکتی چڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ آہستہ آہستہ اُن سے اتنا مانوس ہو گیا کہ کسی اور طرف توجہ بھی نہ کرتا۔ اب گالی دینا تو الگ بات اُس نے بولنا ہی بند کر دیا۔ بس ٹک ٹک بیری کی شاخوں کو دیکھتا اور چہکتے ہوئے پرندوں میں ہی مگن رہتا۔

غالباً بیس جون 1999 کا دن تھا۔ طفیل اپنی بیوی کے ساتھ حجرہ شاہ مقیم فوتگی پر گیا ہوا تھا۔ وہ قائم دین کی ذمہ داری اپنے پڑوسی نذیرے کو سونپ گیا کیونکہ اسے حجرہ میں دو چار دن لگ جانے تھے۔ انہی دنوں یہ خبر اُڑی کہ ہندوستان نے ستلج کا پانی چھوڑ دیا ہے۔ خبر اس وقت پہنچی جب پانی بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس خبر نے سارے اتھاڑ میں ہراس پھیلا دیا۔ پھر بھی اتھاڑ والوں کے پاس بچنے کے لئے کچھ وقت تھا۔ لوگوں کو بتیس سال پہلے کا سیلاب یاد تھا۔ اُنہوں نے جلدی جلدی اپنے بوریا بستر لپیٹے اور بند کی طرف بھاگے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ جو وقت ملا ہے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی ہر ایک چیز بچا لے جائیں۔ لہٰذا ہر آدمی کام میں اس قدر معروف تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ جسے دیکھو اپنا سامان گڈ اور چھکڑوں پر لادے بند کی طرف بھاگا جاتا ہے۔ مکانوں کی چھتوں سے شہتیر نکال لئے گئے اور ایک ایک چیز سمیٹ لی۔ نذیرے نے بھی جلدی سے اپنا سامان باندھا۔ وقت بہت کم تھا، جب کہ پانی تیز رفتاری سے اتھاڑ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے تمام مویشی اور سامان دو تین چکر میں بند پر پہنچا دیے۔ اتنے میں پانی گھر میں داخل ہو کر ٹخنوں سے اوپر اُٹھنے لگا۔ طفیل کو جب سیلاب کی خبر ہوئی تو وہ جلدی سے منڈی احمد آباد آنے والی بس پر بیٹھا تاکہ وقت پر پہنچ سکے۔ وہ منڈی احمد آباد پہنچا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اگلا رستہ اس نے پیدل طے کرنا تھا کیونکہ ان علاقوں میں بس یا تانگے وغیرہ نہیں جاتے تھے۔ اُدھر گاؤں میں پانی گھٹنوں سے اُوپر آ چکا تھا۔ شام چھ بجے تک دریا نے بچی کھچی دیواریں اور مکان بھی برابر کر دیئے۔ قائم دین کی چارپائی پانی میں ڈوب چکی تھی لیکن وہ بے فکری سے پریشانی میں دوڑتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ ہر ایک کو اپنی پڑی تھی۔ لوگ قائم دین کو زنجیر سے بندھا ہوا دیکھتے اور گزر جاتے۔

نذیرے نے بند پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا اور سوچا، شکر ہے، ہر چیز سلامت پہنچ گئی۔ مگر

اچانک اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ طفیل نے قائم دین کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی مگر افراتفری میں کچھ یاد نہ رہا۔ اُس نے چاہا کہ واپس گاؤں جائے مگر پانی کے شور اور اندھیرے سے ڈر گیا۔ سوچنے لگا پانی تو بہت بلند ہو چکا ہے اور زنجیر کی چابی بھی میرے پاس نہیں، لہٰذا اب جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

پانی جب قائم دین کے گھٹنوں سے اُوپر اُٹھا تو وہ بیری کے تنے سے لپٹ گیا اور بیری پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پاؤں میں بندھا زنجیر رکاوٹ بن گیا۔ طفیل ابھی تک آٹھ کلومیٹر اپنے گھر سے دور تھا۔ کبھی بھاگتا اور کبھی چلتا مگر اتنا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کرنا آسان بات نہ تھی۔ جب کہ اِحاطے میں پانی بھی گھٹنوں سے اُوپر ہو چکا ہو۔ رات نو بجے کے قریب پانی جب قائم دین کے کاندھوں تک پہنچا تو اُس نے شدت سے اپنے پاؤں جھٹکنے شروع کیے۔ کبھی ہاتھوں سے زنجیر کھینچتا اور زور سے ہاتھ پاؤں مارتا۔ کبھی بیری پر چڑھنے کی کوشش کرتا لیکن پھر زنجیر آڑے آ جاتا۔ آخر ستر سال کا بڈھا پندرہ کلو وزنی لوہے کے زنجیر سے کہاں تک زور آزمائی کرتا، نڈھال سا ہو گیا اور جس قدر اُوپر اُٹھ سکتا تھا، اُٹھ کر بیری کے تنے سے چمٹ گیا مگر پانی تھا، کہ تھوڑی دیر بعد مزید بلند ہو جاتا۔ اب قائم دین کوئی پانچ فٹ کی بلندی تک زنجیر سمیت بیری کے تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اس قدر وزنی زنجیر کو اُٹھا کر چھپکلی کی طرح مسلسل چمٹے رہنے سے شل ہو گئے۔ اُس پر ستم یہ کہ پانی نے اپنی سطح اور بلند کر لی۔ رفتہ رفتہ اتنا بلند ہو گیا کہ قائم دین غوطے کھانے لگا۔ وہ بار بار زنجیر سے پاؤں پٹختا اور غوطے کھاتا رہا مگر سب کچھ بے سود تھا۔ اندھیری رات میں سوائے پانی کے اُسے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ رات دس بجے اچانک پانی کا پہلا گھونٹ اُس کے منہ میں داخل ہوا۔ پانی اس قدر زیادہ تھا کہ قائم دین سانس نہ لے سکا۔ بے بسی کے عالم میں اُس کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی۔ جس کی آواز سے پورا احاطہ سہم گیا۔ پھر پانی کے اندر کچھ دیر تک ایک بھرپور ہلچل ہوئی، پھر ایک خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جس میں موت کی سی وحشت ہو۔ طفیل ابھی تک اپنے گاؤں سے چار کلومیٹر دور تھا۔

جودھ پور کی حد

مُردوں پر اونچ نیچ تو آتی ہے مگر ایسا قہر پہلے کبھی نہیں پڑا۔ الیاسے! جینے کے قابل نہیں

رہے۔

ابا اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا داغ تو ڈھل نہیں سکتا چاہے لاکھ صفائیاں دیتے پھریں۔

اب تو کچھ ایسا کرو کہ کسی طرح لوگوں کے منہ بند ہو جائیں۔ الیاسے نے مُنہ اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا، بے غیرتا آپ مر گیا اور یہ سوغات چھوڑ گیا ہمارے لیے تا کہ ساری زندگی سر اُٹھا کے نہ چل سکیں۔ حاجی دوبارہ بولا (شریف کی طرف مُنہ کر کے جو ابھی تک چپ بیٹھا تھا) شریفے اب تُو ہی کوئی حل بتا، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

کچھ دیر ٹھہر کر شریف بولا، حاجی میں نے بڑا غور کیا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو اب اس کا ایک ہی حل ہے۔

پھر منہ آگے کر کے آہستہ سے حاجی شریف نے لطف اللہ اور الیاسے کو اپنی تجویز پیش کی جسے سُن کر الیاس تو فوراً متفق ہو گیا مگر اس کا باپ لطف اللہ تذبذب میں پڑ گیا لیکن بالآخر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

جب غفور کی ماں کو طلاق ہوئی تو وہ تین سال کا تھا لہٰذا جودھ پور گاؤں آتے وقت ماں اُسے بھی ساتھ لے آئی۔ یہاں اُس کا نانا غفورے کے ناز اٹھانے لگا۔ جب بھی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا، واپسی پر شرینی یا پھل ضرور لے کر آتا۔ کھلونوں اور کپڑوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ماں الگ پیار دیتی۔ غرض بچپن ناز و نعمت میں گزرنے لگا۔ پانچ برس کا ہوا تو گاؤں کے سکول میں داخل کروا دیا مگر قسمت سے غفورے کو ذہن ایسا ملا جو علم کا بوجھ سہارنے سے یکسر عاجز تھا۔ ایک سال

سکول جاتے ہو گیا۔ مجال ہے ایک لفظ حافظے میں داخل ہوا ہو۔ ایک دن استاد نے غفورے کے آگے ہاتھ باندھے، حضور ہم میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کے دماغ کا ساتھ دے سکیں، جو علم کے لیے بنا ہی نہیں لیکن غفورے کی ماں اُسے ہر حالت میں پڑھانے پر مُصر تھی اور شاید مُصر رہتی کہ اچانک غفور محمد کا نانا فوت ہو گیا۔ چالیسواں ہوئے ابھی پانچ دن ہی ہوئے تھے کہ لطف اللہ نے غفورے اور اُس کی ماں کو ایک الگ جگہ رہنے کو مختص کر دی۔ اب گھر کے چھوٹے موٹے کام یہی کرنے لگا مگر سیدھا کام مشکل ہی سے اُس کے ہاتھ سے انجام پاتا۔ تسلیم کی خُو ایسی کہ گھر کا نوکر بھی کوئی کام کہتا تو بھاگ اٹھتا۔ ظاہر ہے کند دماغ تھا اس لیے کام میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی۔ اُس پر پھٹکاریں بھی سُننی پڑتیں۔ غفورے کی ماں اندر ہی اندر کُڑھتی رہتی مگر بیچاری کر کچھ نہیں سکتی تھی کیونکہ باپ مرنے کے بعد بھائی کے دروازے پر اسی طرح گزارا ہوتا ہے۔ دو تین ماہ یونہی گزرے۔ آخر سکول چھوڑ دیا کہ یہ اُس کے بس کا کام نہیں تھا۔ اب ہر کوئی غفورے ہی کو کام کہنے لگا۔ غفورے بھاگ کے جاؤ سبزی لا دو، غفورے دوڑو، چکی سے آٹا پسوا لاؤ، کوئی کہتا غفورے بوندھو لیتا ذرا میرے سر سے جوئیں نکالنا اور کوئی اس سے ٹانگیں دبواتا۔ ماں اُسے سب کچھ کرتے دیکھتی مگر بے بس رہتی۔ بعض دفعہ اُس نے اسے کام کرنے سے روکا بھی مگر یہ شاید ایسے کام کرنے میں خوش تھا کہ سکول سے جان بچی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ معاملہ چھوٹے کاموں سے بڑھ کر بڑے کاموں تک جا پہنچا۔ لطف اللہ نے زمیندارے کی دیکھ بھال اور مویشیوں کا بوجھ بھی اسی کے سر پر ڈال دیا۔ گویا بے دام کا نوکر تھا کہ لطف اللہ کے ہاتھ آ گیا۔ یوں تو لطف اللہ کا ایک بیٹا محمد الیاس بھی تھا مگر وہ بھی اپنے حصے کا کام غفورے ہی سے لیتا اور رُعب الگ ڈالتا۔ بعض اوقات بڑی بے رحمی سے مارتا بھی۔ پندرہ سال کا ہوا تھا کہ ماں فوت ہو گئی، جس کی وجہ سے پندرہ بیس دن تو لوگ شفقت سے پیش آئے پھر اُس کے بعد کھُل کھیلنے لگے۔ اب غفورے بوندھو کے دو ہی کام رہ گئے تھے کہ ہر کسی کا حکم ماننا اور روٹی کھا کر بھینسوں کے باڑے میں ہی سو جاتا۔ نوکر چاکر بھی اپنا کام اُسی سے لینے لگے۔ اس قدر تسلیم کی عادت نے اُسے بزدل بھی بنا دیا۔ اپنی رائے اور سوچ تو شروع دن سے ہی نہ تھی۔ یہاں تک کہ روٹی بھی تب کھاتا جب کوئی اُسے کہتا۔ بعض دفعہ تو فاقے ہی سو گیا۔ بھینسوں کا دودھ دھو کر گھر پہنچاتا۔ مجال ہے ایک قطرہ بھی پیا ہو۔ غرض انہیں صفات اور بزدلی کی وجہ سے غفورے کا نام غفورا بوندھو پڑ گیا۔ اپنے ماموں زاد الیاس سے تو ایسے

ڈرتا جیسے وہ موت کا فرشتہ ہو۔ اگرچہ دونوں ہم عمر تھے مگر اُس کا ہر حکم بے چون و چرا تسلیم کرتا۔ انہیں حالات میں پچیس سال کا ہو گیا۔

کریماں گھر سے باہر نکلتی تو گاؤں میں ایک طوفان آ جاتا۔ کم بخت نے ناک نقشہ ایسا نکالا کہ قیامت کردی۔ سفید کلیوں کے گجرے بالوں میں ٹانکے رکھتی۔ کلائیاں چوڑیوں سے بھری رہتیں اور ناک کی تھلی تو گویا چاند کے جیسے بڑی تھی۔ تھی تو ابھی کنواری لیکن طور سارے کے سارے سہاگنوں کے۔ ابھی دس سال کی ہو گی کہ باپ آسمانی بجلی گرنے سے جل مرا لہٰذا بھتیجی کی پرورش بھی لطف اللہ کے ذمے آ پڑی۔ باپ چونکہ پچاس ایکڑ چھوڑ کر مرا تھا، اس لیے نخرے سر چڑھ کر بولتے۔ لطف اللہ اور الیاس تو ایک طرف، اس نے کبھی ماں کی بھی نہ سُنی۔ کبھی کسی سہیلی کے ہاں جا نکلتی اور کبھی زمینوں پر ساگ لینے۔ یہ کام تو گویا بہانے تھے، اصل میں اپنے حُسن کی تشہیر تھی۔ الیاس نے پکڑ کر کئی دفعہ پیٹا بلکہ ایک دن تو مار مار کے ادھ مُوا کر دیا اور سر بھی پھوڑ ڈالا مگر ادھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ برملا کہتی، میں کسی سے دبکنے والی نہیں، جو جی آیا کروں گی۔

آخر ایک دن لطف اللہ نے حاجی شریف سے صلاح کر کے کریماں کو غفورے بوندھو سے گانٹھ دیا۔ بچاری بہت چیخی چلائی کہ میں ہرگز بوندھو سے نکاح نہ کروں گی۔ کریماں کی ماں نے الگ شور مچایا کہ یہ ظلم کیوں کرتے ہو۔ میری بیٹی کو احمق اور بدھو سے کیوں باندھ رہے ہو۔ آخر فیصلہ وہی ہوا جو لطف اللہ اور حاجی شریف نے کر دیا اور بالکل اُسی دن الیاس کا نکاح حاجی شریف کی بیٹی ثمینہ سے پڑھا دیا گیا۔ یوں حاجی شریف اور لطف اللہ اور زیادہ قریب ہو گئے جو پہلے ہی ہم زلف تھے۔

یوں تو کریماں کا اپنے باپ کی زمینوں پر حق تھا لیکن تھا وہ صرف کاغذات کی حد تک۔ اُن پر اصل کنٹرول الیاس اور لطف اللہ ہی کا تھا۔ غفورا بوندھو بظاہر تو اُن کا داماد تھا مگر حقیقت میں وہ بھی نوکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ کریماں نے غفورے کے نکاح میں آنے کے بعد اوّل اوّل تو بہت سرکشی دکھائی اور غفورے کو گالی گلوچ بھی کرتی حتیٰ کہ چھتے اور ڈوئی وغیرہ سے مرمت بھی کی۔ پھر رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گئی اور اُسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ نوکر نہیں، اس گھر کا مالک ہے مگر وہ رہا بوندھو کا بوندھو۔ اتنا بڑا ہونے کو ہوا، پھر بھی الیاس سے بغیر مزاحمت مار کھاتا۔

کریماں لاکھ چیختی کہ اپنا الگ کام کرو لیکن یہ اُن کے گھر کا نوکر۔ نکاح ہوئے دو سال

ہو گئے مگر بوندھو نے ابھی تک بھینسوں کا باڑا نہ چھوڑا۔ ہاتھ پاؤں ہر وقت گوبر میں لتھڑے رہتے۔ کریماں ہفتے عشرے بعد زبردستی نہلا دیتی۔ جتنی وہ نفیس اور آرائش پسند تھی اتنا ہی یہ بدلباس اور غلیظ تھا۔

کریماں جب بھی الیاسے کو دیکھتی کہ وہ غفورے پر حکم چلا رہا ہے تو جل کے راکھ ہو جاتی۔ اور سوچتی کہ خدا جانے کم بختوں نے کون سے تعویذ پلائے ہیں۔ اتنا بڑا کتنا ہو گیا لیکن بیلوں کی طرح حکم مانتا ہے۔ اسی طرح تین سال ہو گئے الیاسے کے ہاں دو بچے ہو گئے۔ ثمینہ چھاتی تان کر کریماں کے پاس سے گزرتی اور بات بات میں کچوکے لگاتی۔ ادھر یہ خالی گودی اندر ہی اندر جلتی رہتی اور غفورے کو کوستی مگر وہ برف کی طرح ٹھنڈا جیسے کوئی روبوٹ کام کے لیے بنایا گیا ہو۔ کریماں کے پاس آنے سے بھی ڈرتا کہ کوئی کرنٹ نہ لگ جائے۔ بچاری گاؤں کی عورتوں کے طعنے الگ سنتی پھر ایک رات وہی ہوا جسے ہونا تھا۔ کریماں شاکے کے ساتھ بھاگ گئی جو اسی گھر کا تیلی تھا اور چوہدریوں کی ناک کٹ گئی۔ گاؤں میں چہ گوئیاں ہونے لگیں۔ حاجی لطف اللہ، جو ابھی دو ماہ پہلے ہی حج کر کے آیا تھا، مسجد میں جانے سے ڈرنے لگا۔ الیاسے کے پاؤں کے نیچے تو گویا کوئلے آ گئے۔ وہ کبھی غفورے کو پیٹتا اور کبھی کریماں کی ماں کو کوستا کہ اس نے کیسی ڈائن پیدا کی، جو گھر کی عزت کھا گئی۔

اب غفورے نے چپ سادھ لی۔ وہ کام تو اسی طرح ہی کرتا رہا لیکن طبیعت میں ایک بے چینی اور روکھا پن در آیا۔ اب وہ بجائے باڑے میں رہنے کے، گھر چلا آتا اور دیر تک چولہے کی سرد راکھ کریدتا۔ اگر کوئی بلاتا تو بالکل جواب نہ دیتا، اُٹھ کر اندر چلا جاتا اور کریماں کے کپڑوں میں منہ چھپا کر رونے لگتا۔ بار بار کریماں کے سامان اور چیزوں کو ٹٹولتا پھر گھر سے نکل جاتا۔ اسی حالت میں کافی دن گزر گئے اور عادتیں باؤلے کی سی ہو گئیں۔ بلاوجہ مویشیوں کو مارنا شروع کر دیتا اور آہستہ آہستہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا۔

ایک طرف غفورے کی یہ حالت تھی دوسری طرف الیاسے نے اپنے تمام وسائل شاکے اور کریماں کو ڈھونڈنے میں لگا دیے۔ اُسے ایک ہی دُکھ تھا کہ ایک تیلی اُن کی عزت کو کیسے لے گیا۔ آخر تین ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد دونوں کا کھوج لگ گیا۔ حویلی لکھا کے ایک گاؤں دیوا سنگھ میں، جو ضلع قصور سے ڈیڑھ سو میل دور تھا، میں ایک چوہدری کے ہاں پناہ لے رکھی تھی۔ چھاپہ مارا

تو شاکا تیلی تو بھاگ گیا مگر کریماں پکڑی گئی۔ وہ اُسے گھر لے آئے۔ ماں نے کوسا، الیاسے نے مار مار کے بازو توڑ دیا۔ حاجی لطف اللہ اور حاجی شریف نے الگ سر پر عصاؤں کے وار کیے۔ رات کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا جس کی چابی الیاسے نے اپنے پاس رکھ لی اور کریماں کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے لگے کہ اب اِس کا کیا کیا جائے۔ پورے گاؤں میں سناٹے کا سا عالم تھا۔ کسی شخص کی جرأت نہیں تھی کہ بات کرے۔ الیاسے کا رعب اور دبدبہ نہ صرف سارے گھر پر تھا بلکہ گاؤں کا ہر فرد اُس سے ڈرتا۔ ہر کسی کو پتا تھا کیا ہونے والا ہے۔

فیصلہ کرنے بیٹھے تو بھی حاجی شریف، حاجی لطف اللہ اور الیاس کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ کسی کو اجازت تھی کہ انہیں کوئی مشورہ دے۔ کریماں کی ماں نے دو تین دفعہ اندر آنے کی کوشش کی مگر الیاس کی نظروں سے خوف کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔

رات ایک بجے الیاس نے غفورے بوندھو کو بلایا اور کریماں کو کمرے سے باہر لا کر چل دیے۔ حاجی شریف بھی ساتھ تھا۔ کریماں کی ماں دو ہتھڑ پیٹنے لگی کہ میری بیٹی کو نہ مارو تمہیں خدا کا واسطہ ہے اور اُسے الیاس کے ہاتھ سے چھیننے لگی۔ اسی چھینا جھپٹی میں اُس نے الیاس کے بازو پر کاٹ بھی لیا۔ الیاس نے دو تین تھپڑ اچھی تانی، کریماں کی ماں کے بھی جڑ دیے۔ بیچاری منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔ جب کریماں کی ماں نے شور بلند کیا تو الیاس نے اُسے پکڑ کر اُسی کمرے میں بند کر دیا جہاں کریماں کو بند کیا تھا اور کریماں کو لے کر باہر ویرانے میں آ گئے۔ ایک کلہاڑی اور ایک کسی ساتھ تھی۔ الیاس نے کریماں کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف لٹا دیا اور غفورے کو ساتھ لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ حاجی شریف بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب گڑھا چھ فٹ تک گہرا کھد گیا تو الیاسے نے پکڑ کر کریماں کو اندر پھینک دیا اور غفورے کو حکم دیا کہ کسی سے اوپر مٹی پھینکے۔ حاجی شریف بھی ہاتھوں سے مٹی پھینکنے لگا۔ کریماں کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا مگر وہ بار بار کبھی الیاسے اور کبھی حاجی شریف کو رحم طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ جس کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ حاجی شریف نے اور تیزی سے مٹی پھینکنا شروع کر دی۔ غفورا بھی آہستہ آہستہ مٹی ڈالنے لگا۔ الیاسے نے غفورے کے ہاتھ سے کسی پکڑ کر جلدی جلدی مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ کریماں کا چہرہ مٹی میں چھپنے لگا تو اُس نے آخری رحم طلب نظروں سے غفورے بوندھو کی طرف دیکھا۔ اُسی لمحے غفورے کا ہاتھ

کلہاڑی پر جا پڑا اور ایک دم الیاس کے سر پر لوہے کا پہاڑ گر پڑا۔ اُس کے بعد حاجی شریف دو قدم بھی بھاگ نہ سکا۔ پھر بوندھو اور کریماں نے مل کر الیاس اور حاجی شریف کو گڑھے میں دفن کر دیا اور رات چار بجے سے پہلے جودھ پور گاؤں کی حد پار کر گئے۔

کمی بھائی

حاجی عبدالکریم کے مرنے کی خبر سُن کر عورتیں گھروں سے یوں نکلیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ بازار میں لوگوں کی ایک نہر تھی کہ حاجی صاحب کے گھر کی طرف رواں تھی۔ بعض عورتیں تو بین کرتی جاتیں۔ میں اُس وقت کوئی سات برس کا ہوں گا۔ نہیں کہہ سکتا کہ حاجی صاحب سے میری شناسائی تھی، ہاں مگر صبح سویرے دادی اماں مجھے اُٹھاتی کہ چلو مولوی جی سے قرأت پڑھ کر آؤ تو اُس وقت مسجد میں میرا سامنا پہلے حاجی عبدالکریم سے ہی ہوتا۔ وہ عین پیش امام کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ کئی دفعہ یہ بھی ہوا کہ حاجی صاحب وقت پر نہیں پہنچے تو پیش امام نے انتظار کھینچا اور جماعت میں تاخیر کی۔ میرا اُن سے یہی تعارف تھا۔ اِس کے علاوہ نہ اُنہوں نے کبھی مجھے پوچھا، نہ میں نزدیک ہوا۔

اب اُن کے مرنے پر نہ تو مجھے غم تھا نہ خوشی۔ البتہ قدم غیر ارادی طور پر بڑی حویلی کی طرف اُٹھ گئے اور اب حویلی کے سامنے لوگوں کے مجمع میں کھڑا تھا۔ بین اُٹھ رہے تھے۔

ارد گرد کے گاؤں میں آدمی دوڑا کر اعلان کروا دیے گئے تاکہ سلام دُعا والے کندھا دے سکیں۔ ہمارا گاؤں یا یوں کہیں کہ حاجی صاحب کا گاؤں کافی بڑا تھا۔ جس کی آبادی پانچ ہزار ہوگی۔ بازار کھلے کھلے اور اونچے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گاؤں میں چار بڑی برادریاں تھیں لیکن چوہدراہٹ حاجی صاحب کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی سو گھر کمیوں کا ہوگا۔ حاجی صاحب نے دس حج کیے۔ نماز روزے کی پابندی ہمیشہ کی۔ بھرواں جسم، لمبا قد اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ میں نے ہمیشہ اُسے سفید ململ میں ہی دیکھا۔ ہاتھ میں عصا رکھتے۔ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین بھی انہی کی تھی۔ پنچایت میں مرکزی حیثیت بھی اُن کی ہوتی اور جو مُنہ سے نکل جاتا، پتھر پر لکیر ہوتا۔

کسی کی کیا مجال کہ ان کے آگے دم مارے۔

میں لوگوں کا ہجوم چیرتا ہوا اس کی چارپائی تک جا پہنچا۔ جہاں عورتوں کے رونے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ رونے والیوں میں اکثر عورتیں کمیوں کی تھیں۔ ایک دو منٹ حاجی صاحب کا منہ دیکھتا رہا، جن کی ٹھوڑی کے نیچے سے سفید کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل زرد ہو چکا تھا۔ جبڑے اندر کو دھنسے ہوئے اور منہ کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا اور میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ شاید پہلی بار کسی مردے کو دیکھا تھا اس لیے ڈر گیا۔ باہر آ کر کھلی فضا میں کھڑا ہو گیا اور اُس وقت حیران رہ گیا جب عورتیں یہ کہتے ہوئے گزریں ”بھیناں حاجی صاحب پر آج کوئی روپ آیا۔ اللہ بخشے کتنے نیک تھے“ میں جلد ہی اپنے گھر چلا آیا اور شانی کے ساتھ گولیاں کھیلنی شروع کر دیں۔ مغرب سے پہلے جنازہ اُٹھ گیا۔ لوگ جنازگاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے لیکن مجھے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ رات سوتے میں ڈرتا ضرور رہا۔

دوسرے دن سویرے مسجد گیا تو مولوی جی نے تمام بچوں سے مخاطب ہو کر کہا، بیٹا تمہیں پتا ہے کل حاجی عبدالکریم فوت ہو گئے۔ اللہ بخشے گاؤں کے لیے رحمت تھے۔ آج گاؤں یتیم ہو گیا۔ کیا مجال تھی حاجی صاحب کے ہوتے کوئی گاؤں پر بُری نظر ڈالتا۔ میرے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک تھا۔

اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کے آنسو نکل آئے۔

تھوڑی دیر رُک کر بولے۔

پُتر آج اپنے سپارے لے کر حاجی صاحب کی قبر پر چلو اور تلاوت کر کے اُس کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں شیرینی بھی ہو گی۔

شیرینی کے لالچ میں ہم سب حاجی صاحب کی قبر پر آ گئے۔ قبرستان گاؤں کے مشرقی کونے پر پانچ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور گاؤں کے ساتھ جُڑا تھا۔ دوسری طرف نہر بہتی تھی لیکن نہر کا کوئی اثر قبرستان پر نہیں تھا۔ چاروں طرف مٹی گارے کی دیواریں تھیں۔ قبرستان کے اندر کچی پکی قبریں تھیں۔ کوئی سایہ دار درخت نہ تھا۔ البتہ جھاڑیاں بکثرت اُگی ہوئی تھیں جن میں سانپ اور کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے۔ جگہ جگہ چوہوں نے کھڈیں بنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے اکثر قبریں زمین میں دھنس گئی تھیں۔ آوارہ گدھے اور کتے دن رات پھرتے رہتے۔ بوسیدہ ہڈیاں

اِدھر اُدھر بکھری ہوئیں تھیں، ایسے لگتا کہ چڑیلوں کا یہی ٹھکانہ ہے۔

جب ہم قبرستان پہنچے تو حاجی عبدالکریم کا بڑا بیٹا حاجی سیف الرحمان اور چند دوسرے لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب بڑے ادب سے قبر کے گرد بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کر دی۔ قبر قبرستان کے درمیان میں تھی۔ تلاوت کے بعد مولوی جی نے ختم پڑھا اور شرینی تقسیم کی گئی۔ ہماری اس مصروفیت کے دوران دینے گورکن نے ایک جامن کا پودا قبر کے پائیں کی طرف لگا کر اُسے پانی دے دیا۔ سیف الرحمان نے خوش ہو کر دینے کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ نوٹ لے کر دینہ سیف الرحمان کو دعائیں دینے لگا۔ رخصت کے وقت مولوی جی نے حاجی سیف الرحمان کے گلے مِل کر اُسے دلاسا بھی دیا۔ پھر ہم چل دیے۔ دو چار ہی قدم چل کر مولوی جی اچانک رُک گئے اور سیف الرحمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگے۔

بیٹا سیف الرحمان ایسا کر حاجی صاحب کی قبر کے گرد چھوٹی سی دیوار بنا دے اور قبر بھی پکی کر دے تاکہ بارش اور کتے بلے نقصان نہ پہنچائیں۔ سیف الرحمان نے مولوی کی بات سُن کر سر ہلا دیا۔ دینہ گورکن بھی غور سے سُن رہا تھا۔ اِس کے بعد ہم اپنے گھروں کو چلے آئے اور کھیل دھندوں میں لگ گئے۔ تیسرے دن مسجد میں قُل ہوئے اور ساتویں کو ساتہ۔ جس میں پھل اور مٹھائیاں خوب تقسیم ہوئیں اور ہماری موجیں ہوئیں۔ میں نے دل میں سوچا کاش روز کوئی اِسی طرح مرتا رہے۔ اِس کے بعد ایک ماہ تک مکمل سکوت رہا۔ ایسے لگا جیسے مولوی جی خود بھی حاجی صاحب کو بھول گئے ہوں۔ ایک دن اچانک صبح مولوی جی نے ہمیں فرمایا، بیٹا آج پھر حاجی صاحب کی قبر پر قرآن خوانی کرنی ہے کیونکہ آج حاجی صاحب کا چالیسواں ہے۔ پچھلی بار کی شرینی ہمیں یاد تھی لہٰذا ہم خوشی خوشی چل دیے لیکن اس بار حاجی صاحب کا بیٹا وہاں موجود نہ تھا اور نہ کہیں مٹھائی دکھائی دی۔ ہم سب بددل ہو گئے اور دل ہی دل میں مولوی کو کوسنے لگے۔ فقط دینہ گورکن کھڑا تھا۔ اس نے قبر پر تازہ چھڑکاؤ بھی کیا اور گلاب کی پتیاں بکھیر کر اگربتیاں سلگا رکھی تھیں جن کا خوشبودار دھواں ہمیں اچھا لگ رہا تھا۔ سب سے الگ چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ قبر کے گرد کافی کھلا صحن چھوڑ کے چھوٹی پکی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ جامن کا پودا بھی ہرا بھرا لہلہا رہا تھا۔

گورکن نے آگے بڑھ کر مولوی کو سلام کیا جس کا مولوی صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا۔ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد گورکن بڑے فخر سے بولا، مولوی صاحب پچھلی دفعہ آپ نے

جو مشورہ دیا، اُسے حاجی سیف الرحمان نے میرے ذمے لگا دیا تھا کیونکہ اُن کو اور بھی سو کام ہوتے ہیں اور پھر حاجی صاحب کون سے بیگانے تھے۔ مجھے بھی اپنا بیٹا سمجھتے۔ کچی اینٹیں پڑی تھیں میں نے سوچا قبر تو پکی بنا نہیں سکتا، چلو اس کے گرد کچی دیوار ہی کر دوں۔ حاجی صاحب نیک آدمی ہیں، مجھے بھی ثواب ہو گا۔

پھر آہستہ سے مولوی جی کے نزدیک ہو کر بولا،

مولوی صاحب یہ صحن میں نے اس لیے کھلا رکھ دیا ہے کہ حاجی کی بیوی بیچاری بوڑھی ہو گئی ہے۔ اللہ نہ کرے اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ اس کی قبر بھی حاجی صاحب کے ساتھ بن جائے گی۔ حاجی، حاجن پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ مولوی نے یہ سُن کر گورکن کو تھپکی دی اور حاجی صاحب کی قبر کے متعلق دو تین مشورے مزید دیے۔ اُس کے بعد ہمیں قرآن خوانی کا حکم دیا۔

ابھی قرآن خوانی کر ہی رہے تھے کہ حاجی سیف الرحمان اپنے نوکر کے ساتھ شرینی لے کر آ پہنچا۔ اُسے دیکھ کر ہمارے چہروں پر ایک رونق سی آ گئی اور ہم نے زور شور سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ جتنی دیر ہم قرآن خوانی کرتے رہے۔ حاجی سیف الرحمان مولوی جی اور گورکن آپس میں باتیں کرتے رہے۔ جو قرآن پڑھنے کے شور کی وجہ سے ہمیں سنائی نہ دیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو میں نے دیکھا حاجی سیف الرحمان نے مولوی جی اور گورکن کو ایک ایک سو روپیہ دیا۔ پھر ہم سب واپس چلے آئے اور حاجی عبدالکریم جس سے میری پہلے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، میرے لیے ایک خواب ہو گیا۔ اب گاؤں میں شاید ہی کوئی ہو گا جس نے کبھی حاجی صاحب کا ذکر کیا ہو۔ ایک سال گزر گیا۔ پھر مزید کچھ ماہ بعد میں نے مولوی جی سے قرأت پڑھنا بھی چھوڑ دیا اور مکمل طور پر اپنے کھیل اور سکول کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گاؤں کے بوڑھے مرتے رہے لیکن پھر نہ تو میں نے کسی کا جنازہ پڑھا اور نہ قبرستان کی راہ دیکھی۔ البتہ ایک دفعہ عید کی نماز پر جب مولوی صاحب نے گاؤں والوں کو قبرستان کی خستہ حالی پر شرم دلائی تو انہوں نے پکی چار دیواری کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس میں تمام گاؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور چار دیواری کھڑی کر دی۔ اِس کے علاوہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ میں میٹرک میں جا پہنچا اور عمر کے پندرھویں سال۔ پھر ایک دن اچانک چوہدری خوشی محمد کے مرنے کا اعلان ہوا۔ میں زیادہ غور نہ کرتا لیکن چونکہ چوہدری کا چھوٹا بیٹا امجد میرا کلاس فیلو تھا۔ اس لیے نہ چاہتے

ہوئے بھی جانا پڑا۔ کندھا دیا۔ جنازہ پڑھا۔ حتیٰ کہ دفنانے تک شریک ہوا اور قبرستان میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آٹھ سال بعد نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ حاجی صاحب کی قبر پر ایک بڑے جامن کے درخت کے علاوہ اور بہت سے درخت قبرستان میں اُگے ہوئے ہیں۔ اکثر قبریں پکی ہو چکی ہیں اور بہت سوں کے گرد کھلی چار دیواریاں جن کے احاطے پانچ پانچ مرلے تک کھلے تھے اور قبروں پر نام نسب کے کتبے الگ۔ حاجی عبدالکریم کی قبر پر تو ایک گنبد بھی بن چکا تھا جس کے اندر اب حاجی کی بیوی بھی دفن ہو چکی تھی۔ جو دو سال پہلے فوت ہوئی۔ یہ گنبد غالباً اُسی وقت بنایا گیا لیکن قبرستان میں ابھی بہت سی جگہ خالی تھی۔ مجھے یاد ہے چوہدری خوشی محمد کی قبر کی تیاری کے وقت بھی میں امجد کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہمارے جانے سے پہلے ہی ودیئے گورکن نے قبر ایک کھلی جگہ پر کھودی اور ارد گرد کی قریباً پانچ مرلے جگہ جھاڑ جھنکار سے صاف کر دی جسے دیکھ کر ہم داد دیے بغیر نہ رہ سکے بلکہ امجد نے ودیئے کو دو سو روپے انعام بھی دیا جس پر ودیئے نے چوہدری خوشی محمد کی کافی تعریف کی اور کہا چوہدری صاحب میں نے سوچا ہمارے چوہدری خوشی محمد بڑے اچھے آدمی تھے قبر ذرا کھلی جگہ پر بناؤں تاکہ فاتحہ کہنے میں آسانی رہے۔ جگہ میں نے صاف کر دی ہے۔ اب چوہدری جی کل پکی اینٹوں کی دیوار کروا دیں تاکہ یہ جگہ گھیرے میں آجائے اور محفوظ ہو جائے۔

میٹرک کرنے کے بعد میں شہر چلا آیا تاکہ مزید پڑھ لوں۔ گاؤں میں ہمارا ایک ہی گھر تھا جو یو پی سے مہاجر ہو کر آیا تھا اور نہ جانے کن حالات میں اِس گاؤں میں آ بیٹھا۔ عزیز و اقارب لاہور اور کراچی جا بسے۔ اس لیے ہماری یہاں کوئی برادری نہیں تھی جبکہ گاؤں کی باقی آبادی مقامی تھی۔ لہٰذا اثر رسوخ نہ ہونے کی بنا پر ہمارا شمار بھی کمیوں میں آتا۔

شہر میں مَیں نے ایک میڈیکل سٹور پر رات کی نوکری کر لی جو دو بجے تک جاری رہتی۔ اڑھائی بجے سو جاتا۔ صبح نو بجے کالج نکل جاتا۔ اس طرح گاؤں میں میرے چکر ہفتے کی بجائے مہینے پر جا ٹھہرے۔ شہر میں کافی دوست بھی نکل آئے لہٰذا گاؤں جاتا تو اگلے ہی دن واپس چلا آتا۔ یوں مدت تک قبرستان کی طرف گزر نہ ہوا اور شہر میں آئے مجھے چھ سال ہو گئے۔ اِس عرصے میں محکمہ ڈاک میں کلرکی کرنے لگا اور ماہ بہ ماہ تنخواہ لے کر گھر چلا جاتا۔ بلکہ اب کبھی کبھی تو ہفتہ بعد ہی نکل جاتا کیونکہ دادی اماں کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایک دن دفتر میں ڈاک سیل کر رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے آواز دی۔ پاس گیا تو اس نے ریسور ہاتھ میں دے دیا۔ فون سُن

کر چکرا گیا۔ والد صاحب نے دادی اماں کی موت کی خبر سنائی۔ دادی اماں سے میری جس قدر محبت تھی اُس کا پہلا ردِ عمل تو یہ ہوا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ مصیبتوں کی ماری جب سے انڈیا سے آئی، افلاس اور نکبت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دادا میاں آتے ہی چل بسے۔ ترکاریاں بیچیں، سوت کاتے، خود بھوکوں جئی اور چھ اولادوں کو پالا۔ اب جو یہ موت کا پیغام آیا تو مجھے اُس پر بڑا ترس آیا۔ خدا جانتا ہے آج تک اُس سے تہجد قضا نہ ہوئی۔ مجلس کی استطاعت نہ تھی مگر گھر میں ائمہ طاہرین کی چھوٹی موٹی نیازیں دلوانا نہ بھولی۔

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے چھٹی لی، کام چھوڑا۔ بھاگم بھاگ اڈے پر آیا، بس پکڑی اور شام سے پہلے گاؤں جا پہنچا اور اماں کی لاش سے خوب لپٹ کر رو دیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اماں کو نہلایا گیا اور کفن دے دیا۔ عشاء ہو گئی لیکن میت نہ اُٹھی، پھر آٹھ بج گئے، نو بج گئے، جاڑے میں تو بھی آدھی رات جا بجتے ہیں۔ ہمارے گھر میں رونے دھونے کے علاوہ چہ میگوئیاں بھی جاری تھیں اور ابا میاں کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا ابا جی اماں کی میت نہیں اُٹھی اب کس کا انتظار ہے؟ بولے، انتظار تو کسی کا نہیں، بس قبر کی دیر ہے۔ میں نے کہا، شام سے اب تک قبر کیوں نہ بنی؟

بولے! قبرستان میں جگہ نہیں۔

میں نے کہا، یہ کیا ہوا، اتنا بڑا قبرستان ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اڑھائی قبریں تھیں۔

بولے لیکن اب جگہ نہیں رہی۔

اتنا سننا تھا کہ میں بھاگا قبرستان آیا۔ گورکن کے گھر کا دروازہ پیٹا جو قبرستان کے اندر ایک کونے میں تھا اور اب سارے کا سارا پکا ہو چکا تھا۔

گورکن باہر نکلا تو میں نے پوچھا، چاچا کیا بات ہے قبر نہیں بناتے؟ اماں باہر پڑی ہے۔ کہنے لگا۔ بھائی کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں بڑھیا کا کہیں اور بندوبست کرو قبرستان میں جگہ نہیں۔

میں نے کہا چل دیکھتے ہیں، جگہ کیسے نہیں؟

بولا، تیرے باپ کا نوکر ہوں؟ آدھی رات قبریں پھلانگتا پھروں اور سانپ ڈسوا لوں۔

میں نے کہا، چل نہیں تو نہ سہی میں خود جگہ ڈھونڈ لوں گا۔ جیسے ہی واپس مڑا اور قبرستان

میں داخل ہوا تو اُس نے پیچھے سے پھر آواز دی۔ "خبردار" اگر کسی دوسرے زمیندار کی قبروں کے احاطے میں قبر بنائی ورنہ صبح مردہ باہر نکال پھینکیں گے۔ پھر نہ کہنا یہ کیا ہوا؟

جب میں قبرستان کے اندر آیا۔ جاڑے کی چاندنی رات تھی گویا دودھ برس رہا تھا۔ پورے قبرستان میں احاطے ہی احاطے تھے اور اندر دو دو تین تین قبریں باقی جگہ خالی۔ دو تین جگہ مجھے بڑے گنبد بھی نظر آئے۔ حیران کہ اب کیا کروں اور اماں کو کہاں دفن کریں۔ اتنے میں دور قبرستان کی آخری نکڑ پر لالٹین کی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ قریب گیا" دیکھا تو میرے چچا زاد قبر کھود رہے تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی چار دیواری کے ساتھ ایک لاوارث جگہ ڈھونڈ نکالی اور اب وہ قبر بنا رہے تھے۔

خیر رات دو بجے اماں کو دفن کیا۔ جنازے میں چندرہ لوگ تھے۔ مولوی جاڑے کے ڈر سے نہ آسکے۔ جنازہ باوا جان نے پڑھا۔

اگلے دن صبح نو بجے چوکیدار نے ابا کو آواز دی کہ حاجی سیف الرحمان یاد کرتے ہیں۔ بابا نے مجھے ساتھ لیا۔ حویلی پہنچے تو سو آدمی بیٹھے تھے، جس میں تمام برادریوں کے لوگ موجود تھے۔ دینہ گورکن بھی وہاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیوری چڑھ جائی۔ ہم سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ابا میاں حیران کہ خیر ہو۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

جب سب بیٹھ گئے تو سیف الرحمان کی گرجدار آواز نے سکوت توڑا۔

میاں تقی محمد! رات تیرے چھوکرے نے دینے سے بدتمیزی کی۔ آدھی رات بڑھیا کی قبر بنوانا پھرتا تھا اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے قبرستان میں کمتیوں کے لیے مزید جگہ نہیں۔ رات کی بات تو ہم نے پی لی مگر آئندہ کے لیے سارے کمی اپنا بندوبست کرو۔ قبرستان صرف اُن کے لیے ہے جن کی گاؤں میں زمین ہے۔ آج تک کمتیوں کی جو قبریں بن گئیں، وہ بھی ہمارا احسان سمجھو۔

اور سنو" دینے گورکن نے تمہارا کمتیوں کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا کہ قبریں کھودتا پھرے۔"

میرا پنچایت بلانے کا آج صرف یہی مقصد تھا۔

یہ کہہ کر حاجی سیف الرحمان اُٹھ گیا۔ کس کی مجال کہ دم مارے۔ ہم بھی اپنے گھر چلے آئے۔

دوسرے دن شام کمتیوں نے خادم تیلی کے گھر اکٹھ کیا اور فیصلہ ہوا کہ کمی برادری دو کنال جگہ قبرستان کے لیے۔ الگ لے ہر گھر کو اڑھائی سو روپیہ لگا دیا۔ پانچ دن میں پچیس

ہزارا کٹھا ہوا اور گاؤں سے دو کلو میٹر دور راؤ عبدالشکور سے دو کنال جگہ خرید لی گئی۔ اگرچہ شورزدہ تھی لیکن انہوں نے کونسا فصل بونا تھی۔ البتہ کچھ دور تھی۔

اب جو کوئی مرتا اُس کے وارث خود قبر بنا لیتے۔ گورکن کی بھی ضرورت نہ رہی اور مولوی کی کمی اس لیے محسوس نہ ہوئی کہ ابا میاں جنازہ پڑھا دیتے۔

اُدھر زمینداروں کا گورکن دینہ تھا۔ جس نے قبرستان کو جنت نشان بنا دیا۔ پکی قبریں اور جگہ جگہ گنبد۔ ہر طرف سایہ دار درخت، پانی کی کمی درمیان سے گزرنے والا نالہ پوری کرتا۔

اب قبرستان میں زمینداروں کے لیے کافی جگہ تھی جو مدتوں کام آتی اور ختم نہ ہو سکتی تھی کہ قبرستان میں ہر ایک نے اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔

میں اب بھی کبھار گاؤں جاتا تو اماں کی قبر پر ضرور جاتا اور ہر طرف سفید مرمریں قبریں دیکھتا، یوں دس سال اور بیت گئے۔ کوئی مسئلہ نہ بنا۔ میں نے دیکھا کہ دینہ اب بوڑھا ہو چکا تھا مگر قبروں کی دیکھ بھال اُسی محنت سے کرتا۔

اگلی دفعہ چھ ماہ بعد گاؤں گیا تو پتہ چلا کہ آج صبح دینہ گورکن مر گیا۔ میں نے یہ خبر فقط سُن لی تھی۔ زیادہ دلچسپی نہ لی۔ حتیٰ کہ شام تک ویسے ہی بھول گیا۔ دوسرے دن دس بجے اپنے گھر میں باوا جان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گرمیوں کے دن اور سخت دھوپ چڑھ آئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اُٹھ کے باہر آیا تو سامنے چوکیدار تھا۔

کہنے لگا، حاجی صاحب حویلی بلاتے ہیں۔ میں باوا جان کو بتائے بغیر حویلی چلا آیا۔ سامنے دیکھا تو حاجی صاحب بڑے موڑھے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسرے لوگ اور کمی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر حاجی سیف الرحمان نے کہا، میاں تقی نہیں آیا؟ میں نے کہا چوہدری صاحب وہ ذرا بیمار ہیں، آپ حکم کریں، میں آ گیا ہوں۔

کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد بولے،

تمہیں پتہ ہے، کل دینہ گورکن مر گیا اور لاش ابھی تک پڑی ہے۔ کفن دفن کسی نے نہیں دیا۔ گرمیوں کے دن ہیں اور دینے کی لاش بدبو چھوڑنے لگی ہے۔ تمہارا کمی بھائی تھا لیکن تمہیں ذرا خیال نہیں آیا۔ جاؤ اس کا بندوبست کرو۔

"اچھے کمہیار کی طرف دیکھتے ہوئے۔" اچھے تم قبر کھودو۔ اور طیلے تُو دینے کو غسل

دے۔ کفن کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔

''اور میری طرف مخاطب ہو کر'' علی حسین تو پڑھا لکھا ہے ذرا جنازہ پڑھ دینا، مولوی آج فارغ نہیں۔

اتنا کہہ کر حاجی صاحب کھڑے ہو گئے اور مڑتے ہوئے پھر رُکے، اور'' ہاں'' گاؤں کے قبرستان میں جگہ نہیں، اُدھر اپنی طرف ہی لے جانا۔

maablib.org

معمار کے ہاتھ

حاجی صاحب! ان بچوں کو تعلیم دینا میرے بس میں نہیں کوئی اور بندوبست کر لیجئے۔ اُس نے بیزاری سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا آپ سے بڑھ کر اور کیا بندوبست ہوگا" حاجی الطاف شرمندگی سے بولا، ان کم بختوں کی تعلیم کے لئے، میں نے شہر کا کوئی بھلا آدمی نہیں چھوڑا۔ مگر ہر کوئی بمشکل ایک مہینہ پورا کرتا ہے۔ سوچا تھا، تم فارغ پھرتے ہو، شریف گھر کے پڑھے لکھے ہو، کچھ نہ کچھ کر گزرو گے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملے، ان کو تعلیم دے دو۔

حاجی صاحب! آپ کی سب باتیں ٹھیک مگر یہ آپ کے پوتے مجھ سے ڈرتے نہیں اور سبق پر بھی کان نہیں دھرتے۔ میں ایسے ہی اپنا اور ان کا وقت ضائع کروں گا۔ پھر سارا دن مزدوری کرنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ شام کو یہ مصیبت نہیں اُٹھتی۔' وہ ڈیوڑھی سے باہر نکلتے ہوئے رُکا اگر آپ کو مجھ سے واقعی ہی ہمدردی ہے تو میری ملازمت کے لئے کچھ اور بندوبست کرا دیجئے یہ بچے تو مجھ سے نہیں پڑھائے جاتے۔

چلو کوئی بات نہیں۔' حاجی کہنے لگا' لیکن میں نہیں چاہتا کہ تو مزدوری کرتا ہی بوڑھا ہو جائے اور ساری عمر مسجدوں کے مینار بنانے میں گزار دے۔

تو پھر کیا کروں؟ اُس نے جواب دیا۔

ایک کام کر، تُو میرے بیٹوں کے پاس چلا جا۔ حاجی الطاف نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا، وہاں جلد ہی خدا کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔

ٹھیک ہے، لیکن ابا سے پوچھ کر بتاؤں گا، اُس نے چلتے ہوئے کہا۔

اصغر کو باپ کے ساتھ مزدوری کرتے ہوئے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ اُس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر پہلے اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ آیا وہ تر ہو چکی ہے کیونکہ دیوار ذرا سی بھی خشک ہو تو اُس پر پلستر کرنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ہاتھ لگانے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ ابھی دیوار پلستر کرنے کے قابل نہیں۔ اصغر نے مزدور کو مزید پانی پھینکنے کا کہا، پھر اپنے والد کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ جو پلستر شدہ دیوار پر آرائشی ٹائلیں چپکا رہا تھا۔ ٹائلوں کا کام بہ نسبت پلستر کے آسان تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ کام کو اِس طرح آپس میں بانٹ لیتے کہ سخت کام اپنے ذمے لے لیتا اور قدرے آسان اپنے باپ کے حوالے کر دیتا۔ اصغر نے دیکھا کہ اُس کے باپ کے ہاتھ ٹائل لگاتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ وہ اُس کی سفید ریش کو غور سے دیکھنے لگا، جس میں سیمنٹ کے چھینٹے سیاہ مٹی کی طرح چپنے ہوئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں کچھ زیادہ اُبھر آئیں تھیں۔ یہ دیکھ کر اُسے شدت سے احساس ہوا کہ اُس کا باپ کافی بوڑھا ہو چکا ہے اور اس عمر میں اُسے کام نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ایک ہنر مند راج گیر تھا۔ شہر کی تقریباً تمام نئی مسجدوں کی تعمیر اُنہی کے ہاتھوں ہوئی۔ باپ کے ساتھ اتنا عرصہ کام کرنے سے اُس نے وہ تمام ہنر سیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر چپکے سے باپ کو کام کرتے دیکھتا رہا پھر اچانک اُس نے حاجی الطاف سے ہونے والی کل شام کی گفتگو من وعن سنا دی۔

بات سننے کے بعد اُس کے باپ نے کرنڈی تغاری میں رکھتے ہوئے کہا، بیٹا آگے تمہاری مرضی لیکن ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آج کل عربوں میں سوائے ذلالت کے کچھ نہیں۔ تیرے سامنے میں تین سال کویت میں رہ آیا لیکن یہ کرنڈی اور تیسی ہاتھ سے نہ چھٹی۔ رہی حاجی الطاف کے بیٹوں کی بات؟ اُس کا جواب یہ ہے کہ تاجر اور سنیارے میں "کھال جائے مال نہ جائے" والی بات ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ تیرے یار نہ بنیں گے۔ اصغر نے تحمل سے باپ کی نصیحت کو سنا۔ لیکن اب وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ جدہ ایئر پورٹ پر اُترتے ہی امیگریشن کے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ امیگریشن کے پانچ کاؤنٹر تھے جن پر عملہ موجود نہیں تھا۔ وہ پہلے کاؤنٹر پر لگی ہوئی قطار میں دوسرے نمبر پر کھڑا تھا۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ہر قطار میں سو آدمی جمع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں احرام باندھے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا گروہ بھی آ گیا جن کے ہاتھوں میں تسبیح اور لمبی داڑھیوں کے ساتھ سر منڈے ہوئے تھے۔

ایمگریشن ہال میں ان کے دیر سے پہنچنے کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ جہاز سے نیچے اُتر کر ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ اُن سے ایک عجیب قسم کی بُو آ رہی تھی۔ اصغر نے سوچا اگر وہ زیادہ دیر اُن کے ساتھ کھڑا رہا تو اُسے تے آ جائے گی۔

بابا جی آپ پیچھے قطار میں کھڑے ہوں اس لئے کہ ہم پہلے سے آئے ہیں۔ اصغر ڈرتے ڈرتے بولا۔

بے فکر رہو بیٹا ''احرام والا بولا'' اپنی باری پر ہی پاسپورٹ چیک کروائیں گے۔ ہم جانتے ہیں عمرہ کرنے آئے ہیں۔ کبھی بے انصافی نہیں کرتے لیکن جیسے ہی عملے نے کام شروع کیا احرام والوں نے ایک دم ہلہ بول دیا۔ قطار میں کھڑے تمام لوگوں کو ایک طرف دھکیل کر آگے ہو گئے۔ اس کشمکش میں اصغر آخر میں جا پہنچا۔ ایک گھنٹے کی ذہنی اذیت کے بعد جیسے ہی اگلے بوتھ پر گیا کچھ شُرطوں نے اُسے گھیر لیا اور پاسپورٹ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ حیران تھا کہ اب کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں شُرطے نے کہا ''الا خا جی خمسون ریال۔

لم الا عشرۃ وخمسۃ، اُس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا۔

الا خمسون، بل طرف الی مکۃ، آپ کا ویزہ عمرے کا ہے۔ پاسپورٹ آپ کو مکہ میں ملے گا۔ دوسرے کسی شہر میں جانے کی اجازت نہیں شُرطے نے کہا۔

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک تو اُس کے پاس احرام نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں قیام کر سکے۔ اُس کا ارادہ عمرہ کرنے کا تو تھا مگر پہلے جدہ میں حاجی الطاف کے بیٹوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چلتے وقت اُن کو فون کر کے اطلاع کر دی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ وہ ایئر پورٹ پر لینے آ جائیں گے لیکن اب یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ اُس کے پاس صرف سو ریال تھے۔ کافی دیر معاملے کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد اُس نے شُرطے سے کہا، کچھ کم نہیں ہو سکتے؟

پچاس ریال دو ورنہ سیدھے مکہ چلو۔ شُرطہ نہایت بے رحمی سے بولا۔

آخر بے چارگی سے اُس نے پچاس ریال شُرطے کے ہاتھ میں دیے اور پاسپورٹ لے کر جس قدر جلد ہو سکتا تھا ایمگریشن ہال سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اُس پر ٹیکسی والے ٹوٹ پڑے مگر وہ ہر ایک کے پاس سے بے نیازی سے گزر گیا۔ وہ جانتا تھا حاجی الطاف کے بیٹے اُسے

لینے کے لئے آئے ہیں۔ باہر آ کر بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ہر طرف دیکھا لیکن اُسے وہ نظر نہ آئے۔ آخر تنگ آ کر ٹیلی فون بوتھ سے انہیں فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ گھر سے ہی نہیں نکلے تھے۔ البتہ اُنہوں نے پتہ لکھوا دیا اور کہا ٹیکسی کروا کر خود آ جاؤ۔ بیگ کاندھے سے لٹکائے فون بوتھ سے باہر آ کر وہ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے دیکھتے ہی ایک ٹیکسی والا فوراً بھانپ گیا اور آگے بڑھ کر بولا جدہ جانا ہے؟

جی ہاں اصغر نے کہا۔

کہاں جاؤ گے؟ ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

'بنی مالک' اور کاغذ پر لکھا ہوا پتہ اصغر نے ڈرائیور کو تھما دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کاغذ دیکھ کر واپس کر دیا اور دروازہ کھول کر بیٹھنے کو کہا۔

پہلے بتاؤ کیا لو گے؟ اصغر جھجکتے ہوئے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

بھائی تم اپنے پاکستان سے آئے ہو، اس لئے چالیس ریال میں پہنچا دوں گا۔

چالیس ریال تو بہت زیادہ ہیں، اصغر ایک دم پیچھے ہٹا، بیس ریال لے لو۔

نہ میاں بیس ریال تو بہت کم ہیں، ڈرائیور نے صاف اردو میں جواب دیا۔ یہاں سے جدہ شہر بہت فاصلے پر ہے پھر 'بنی مالک' تو اُس سے بھی آگے ہے۔ کرایہ طے نہ ہونے پر اصغر بیگ کاندھے پر لٹکائے ٹیکسیوں کے حلقے سے باہر آ گیا اور سوچنے لگا، کیوں نہ شہر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر کسی سے لفٹ لے لے۔ اس طرح پیسے بھی بچ جائیں گے۔ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایئر پورٹ کافی پیچھے رہ گیا۔ سڑک کے دونوں طرف کھجور کے جھنڈ تھے۔ اُس نے اپنا بیگ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ رکھ دیا اور چاندنی کی روشنی میں کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر دُور تک پھیلے صحرا میں کھجور کے درختوں سے چھن کر گرتی چاندنی اُسے ایک عجیب طلسمات میں لے گئی۔ پکی ہوئی کھجوریں بڑی تعداد میں ریت پر ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ اصغر نے جھک کر ایک کھجور پکڑی اور کھالی۔ کھجور اتنی میٹھی تھی کہ کبھی ایسی لذت نہ ملی تھی۔ وہ چاندنی کی روشنی میں مزید کھجوریں چن چن کر کھانے لگا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے کھجوروں کے پتے اُس پر سحر طاری کر رہے تھے۔ جب دُور سے کسی کار کی روشنی دیکھتا، فوراً سڑک پر آ کر ہاتھ کا اشارہ کر دیتا مگر کار فرّاٹے سے گزر جاتی۔ اُسے کار کے گزرنے پر کوئی افسوس نہ ہوتا۔ اس لئے کہ

کھجوریں کھانے میں کافی مزہ آرہا تھا۔ غالباً ایک گھنٹے تک وہ کھجوروں کے جھنڈ میں پھرتا رہا۔ بہت سی کھجوریں چن کر اُس نے اپنے بیگ میں بھی ڈال لیں۔ اسی دوران صبح کی اذان ہوگئی۔ اذان سنتے ہی وہ دوبارہ سڑک پر آگیا اور واپس ایئر پورٹ کی طرف چل پڑا۔ اب وہ کھجوروں سے اُکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد شہر پہنچ جائے۔ اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں کوئی لفٹ نہیں دے گا کیونکہ وہ پاکستان کو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

عصر کے وقت اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ایئر کنڈیشنڈ نے کمرہ اس قدر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ اُسے سردی محسوس ہونے لگی۔ ایسے کمرے میں سونے کا آج پہلا اتفاق تھا۔ اصغر نے محسوس کیا جیسے جسم اکڑ گیا ہو۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو گرم ہوا نے منہ جلا کے رکھ دیا۔ ایسی ہواؤں کا سامنا غالباً پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خیر وضو کر کے دوبارہ کمرے میں آیا اور عصر کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ دیر دعائیں مانگتا رہا۔ اُس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی نماز قضا نہیں کرے گا اور جیسے ہی کام پر لگ گیا، فوراً گھر اطلاع دے گا۔

وہ یہ سوچ کر لطف لینے لگا کہ جن جگہوں کا تاریخ کی کتابوں اور اساطیر کے حوالوں میں ذکر پڑھتا آیا ہے، کل اُنہیں عین اپنی آنکھوں کے سامنے پائے گا۔ انہی خیالات میں گم شام کے وقت حاجی ناصر کے ساتھ جدہ کی گلیوں میں پھرتا رہا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہزاروں پاکستانی، ہندوستانی اور بنگالی گھومتے پھرتے ہیں۔ بعضوں نے بڑی بڑی ہوٹلیں، ریستوران اور دوسرے کاروبار چلا رکھے ہیں۔ کچھ ایسے بھی نظر آئے جو مانگتے پھرتے تھے۔ وہ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت سے ہندوستانی لڑکے گروہ کے گروہ کھڑے تھے۔ اُس کے پوچھنے پر حاجی ناصر نے بتایا، یہ لڑکے عربوں کو اسی طرح چوراہوں میں کھڑے ہو کر بلیو پرنٹ فلمیں بیچتے ہیں۔ کچھ لڑکے خود بھی ساتھ بک جاتے ہیں۔ گلیاں کوچے اور بازار دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ اذان کے ساتھ ہی دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ بند ہونے لگے۔ ریستورانوں کے دروازوں پر وقفہ نماز کے بورڈ اُبھر آئے۔ ہزاروں طرح کی مخلوقات اپنی جیبوں سے ٹوپیاں نکالتے ہوئے مسجدوں کی طرف بھاگی۔ کوئی ذی روح اُس وقت سستی نہیں دکھا رہا تھا حتیٰ کہ وہ خود بھی اُنہی میں شامل ہو گئے۔

رات اُس نے انتہائی بے چینی میں کاٹی۔ حرم کی زیارت کے شوق میں نیند اُڑ گئی

تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ کتنے ایسے بدنصیب ہیں جو کروڑوں روپے کے ہوتے ہوئے بھی حجاز مقدس کی زیارت سے محروم ہیں۔ انہی خیالات میں خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ وہ جلدی سے اُٹھا، غسل کیا اور احرام باندھ لیا۔ حاجی ناصر نے اُسے تین سو ریال اور عمرے کے لئے احرام اُدھار دے دیا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں دس ریال کرائے پر سوار ہو گیا، جس میں تین آدمی پہلے بھی موجود تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اُس نے بے چینی کے ساتھ ڈرائیور سے سوال کیا۔ میاں حرم کتنے فاصلے پر ہوگا؟

ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔

حرم کتنے رقبے پر پھیلا ہوا ہے؟ اصغر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

مافی معلوم یا اخی؟ ڈرائیور نے نہایت سفاکی سے کہا۔

ڈرائیور کے اس دو ٹوک جواب سے وہ دبک کر بیٹھ گیا اور سیٹ کے ساتھ سر لگا کر بڑے انہماک سے سڑک کے دو طرفہ خشک پہاڑوں اور ریگستانوں کو دیکھنے لگا۔ کبھی کوئی پہاڑ کے دامن میں ہٹ نظر آتا اور پیچھے گزر جاتا، کبھی ہوا کا بگولا ریت اُڑاتا ہوا آسمانوں کی طرف اُٹھ جاتا۔ وہ دل میں گمان کرتا، شاید ان رستوں پر بھی پیغمبرِ اسلام گزرے ہوں۔ اگرچہ ٹیکسی کی رفتار بہت زیادہ تھی لیکن اُسے یہ سفر بڑا طویل لگا۔ وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنا دماغ تاریخ کے چودہ سو سال پرانے جھمیلوں میں مصروف کر لیا۔ رسول پاک کی دعوتِ عام، ابو طالب کی حمایت، ہجرت، جنگِ بدر، اُحد، خندق، وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے یہ کہہ کر چونکا دیا، بھائی اُترو حرم آ گیا۔ یہ سن کر وہ جلدی سے کپڑوں کا بیگ سمیٹ کر باہر نکل آیا۔ سامنے حرم کا مشرقی دروازہ ایک طلسماتی ہیبت سے اُسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

وہ کھنچا ہوا آگے بڑھا۔ نسل نسل کے کالے گورے لوگ بغیر اجنبیت کے گھوم رہے تھے۔ ہزاروں کبوتر بے خطر اُڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اگرچہ گیارہ کا عمل تھا مگر دھوپ کے باوجود اُسے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ حرم کے اندر داخل ہوا، نفل پڑھے اور مناسکِ عمرہ میں مشغول ہو گیا۔ کعبے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اللہم لبیک کہتے ہوئے طواف کیا۔ ہجوم بہت زیادہ تھا لیکن اُس نے ہر طواف پر حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر صفا و مروہ کی سعی کی۔ صفا پہاڑی پر سفید لباس میں پریوں کے جھرمٹ اُسے اپنی طرف کھینچتے رہے۔

مگر آج وہ اس قسم کے کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ سعی کرنے کے بعد دوبارہ کعبے

کے پاس آ گیا۔ اُس نے مقامِ ابراہیم کو بوسہ دیا تو پاس کھڑے ایک شُرطے نے اُس کے کاندھوں پر چھڑی دے ماری۔

لالا حاجی، ہذا الشرک۔

انا العالم" اصغر نے جواب دیا"

لالا انت الجاہل۔ شُرطہ چیخ کر بولا اور چھڑی دوبارہ پیٹ میں چبھودی۔

اُسے شُرطے پر غصہ بہت آیا لیکن نظرانداز کرتے ہوئے دوبارہ عبادت میں مشغول ہو گیا۔ عبادت کرنے کے ساتھ اُس نے اپنا تصور تاریخ سے جوڑے رکھا تا کہ کعبے کی زیارت کا صحیح لطف آئے اور حرم کی ہر اُس چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی، جس کے بارے میں اُس نے کچھ بھی پڑھ سُن رکھا تھا۔ بڑی دیر تک غلاف کعبہ پکڑے ہوئے دعائیں مانگتا رہا۔ تمام دن حرم میں گزار کر شام سے کچھ پہلے باہر نکل آیا۔

عمرے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دوسرے مقامات بھی دیکھنا چاہتا تھا لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے اُس نے انہیں کل پر ٹال دیا اور کھلے میدان میں بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ یہ جگہ ابو طالب کے گھر کے پاس کوہِ ابو قبیس کے پہلو میں تھی۔ وہاں اُس جیسے دوسرے کئی لوگ سو رہے تھے، جو ہوٹل میں رہنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ نیند کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ کچھ خبر نہ رہی۔ ایک شُرطے نے اذانِ صبح کے وقت اُسے ٹھوکر مار کر اُٹھایا۔

نماز پڑھتے ہی وہ مکہ کے کوچوں میں نکل گیا۔ گلیاں اور سڑکیں انتہائی صاف، پتھر لگا کر پختہ کی گئی تھیں۔ پھرتا پھراتا اور پوچھتا ہوا مقام حجون پر گیا۔ یہاں خاندان رسالت اور بنی ہاشم کی قبریں تھیں۔ ظہر تک اُس نے کئی مقامات کی زیارت کر لی اور مسجدِ احرام میں آ کر نمازِ ظہر ادا کی۔ پھر اُس کا یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ صبح پیدل نکل جاتا، مکے کی وادی میں گھومتا اور سہ پہر سے پہلے واپس آ جاتا۔

آج اُس کا مکہ میں آٹھواں دن تھا۔ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے بھی ۱۴۰ ریال خرچ ہو چکے تھے۔ اُس نے سوچا، اب اُسے جلد مدینہ چلے جانا چاہئے اور وہاں کی زیارت کے بعد فوراً کام پر لگ جانا چاہئے۔

تیس ریال کا ٹکٹ لے کر وہ بس میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک پندرہ سولہ سال کا سیاہ فام لڑکا

دو بچیوں کے ساتھ سوار ہوا۔ غالباً وہ دونوں اُس کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ تینوں اگرچہ کالے تھے لیکن تین نقش میں ایک کشش اور معصومیت ضرور تھی۔ دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ لڑکے نے چاروں طرف ایک نگاہ ماری پھر اصغر کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بس چلی تو سیاہ فام لڑکے نے سکوت توڑا۔

ما اسمک یا اخی؟

اسمی علی اصغر، و مَن اَنت؟

اسمی عبداللہ ابن سَعید یا رفیقی، سیاہ فام لڑکے نے جواب دیا۔ اس کے بعد مختلف ممالک کی کرنسی نکال کر دکھانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے ہر ملک میں دوست موجود ہیں۔ امریکہ، یورپ، افریقہ، عراق، شام، ہندوستان اور ایران میں۔

و مِن الباکستان فی الرجال کیا پاکستانی کوئی دوست نہیں؟ اصغر نے پوچھا۔

لا لا کل باکستانی حرامی کل سارق۔ وہ بگڑ کر بولا لا واحد رفیق من باکستان۔

یہ سن کر اصغر کا رنگ اُڑ گیا اور اُس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

چند ثانیے اسی خاموشی میں گزرے تھے کہ لڑکا پھر بولا، و اَنت مِن اَلا ایران؟

لَم ولکِن مِن الباکستان، اصغر نے روکھے انداز میں جواب دیا۔

سیاہ فام لڑکے کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ غلطی سے وہ اُسے گورے رنگ اور تیکھے نقوش کی وجہ سے ایرانی سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے بعد مکمل سکوت چھا گیا۔

مدینے میں آج اُس کا پانچواں دن تھا۔ مسجد نبوی، احد، خندق اور ہر اُس جگہ کی اُس نے زیارت کی جس کے بارے میں اُسے کچھ بھی علم تھا۔ وہ رات دن مدینے کے کھلے بازاروں اور صاف ستھری سڑکوں پر پھرتا اور مضافات میں موجود کھجوروں کے باغوں کی سیر کو نکل جاتا۔ اُسے مدینے کے مغرب میں عقیق کی زمین روزانہ عصر کے بعد اپنی طرف کھینچ لیتی، جہاں کھجوروں کی سرسبز و شاداب وادی میں سورج کا نظارہ کرتا، جو آسمان پر اُڑتی چھوٹی چھوٹی بدلیوں کو سرخ و سنہری قبائیں پہنا کر شام ڈھلے ہی خشک پہاڑیوں کے اُس پار چھپ جاتا تھا۔ حرمِ رسول کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی دیر تک درود و سلام پڑھتا۔ اُسے اُن بد ایرانیوں پر تعجب تھا جو کپڑے کے تھیلوں میں اپنے جوتے ڈال کر مسجد میں لئے پھرتے اور مسجد کی بے حرمتی کرتے تھے۔

آج وہ چاہتا تھا کہ جی بھر کر مدینے کو دیکھ لے شاید پھر کبھی آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ اسی احساس سے وہ مسجد نبوی اور مدینے کی تمام زیارات کرنے کے بعد مغربی حصے کی سیر کے لئے نکل گیا۔ ابھی ایک فرلانگ طے کیا تھا کہ اُسے ایک زیر تعمیر پلازہ نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اُس میں داخل ہو گیا اور سوچا، اگر اسے یہاں بطور راج گیر کام مل جائے تو کیا اچھا ہو۔ اس طرح وہ مسلسل مدینے میں رہ سکتا ہے۔ زیارات کے علاوہ روزی بھی کما سکے گا۔ یہ سوچتے ہی اُسے مسرت کا احساس ہوا۔ اصغر نے سپروائزر کا نام پوچھ کر اُسے اپنا مدعا بیان کیا۔

کیا کر سکتے ہو؟ سپروائزر نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

راج گیری کا تمام کام کر لوں گا۔ اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

ویزہ عمرے کا لائے ہو گیا؟ سپروائزر نے دوسرا سوال کیا۔

ویزہ تو عمرے کا ہے لیکن اگر آپ کام پر لگا لیں گے تو آہستہ آہستہ کام کرنے کا پرمٹ بھی بن جائے گا۔

اچھا! اس دیوار کو ایک فٹ تک تعمیر کر کے دکھاؤ۔ سپروائزر نے تقریباً دس فٹ لمبی زیر تعمیر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اُس نے کام ملنے کی امید میں تیزی سے آگے بڑھ کر اوزار پکڑے اور ایک ماہر کاریگر کی طرح دیوار تعمیر کرنے لگا حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں ڈیڑھ فٹ دیوار اوپر اٹھا دی۔ جسے دیکھ کر سپروائزر کی آنکھیں کھل گئیں۔ نماز مغرب کے بعد سپروائزر نے اُسے کھانا کھلایا اور بتایا کہ وہ بھی گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے، دس سال پہلے سعودی عرب آیا تھا۔ اس وقت سے مختلف شہروں میں کام کرتا رہا لیکن پچھلے پانچ سال سے اب وہ مدینے ہی میں ہے۔ سپروائزر نے بتایا کہ وہ بھی پہلے راج گیری کرتا تھا مگر اقبال صاحب کی مہربانی سے اب اُس کی جان اس کام سے چھوٹ گئی۔ کل جمعہ ہے، پرسوں آجاؤ۔ میں اقبال صاحب سے بات کر کے آپ کو رکھ لوں گا۔ وہ انجینئر ہیں، لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کام اُن کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔

تو ابھی کام پر کیوں نہیں لگا لیتے؟ اصغر بے چینی سے بولا۔

بھائی یہاں بہت خطرہ ہے۔ یہ جو شُرطے گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ تین تین دفعہ چیک کرتے ہیں کہ کوئی آدمی بغیر پرمٹ کے کام پر تو نہیں لگا۔ انجینئر صاحب کسی سے بات کریں گے

اُس کے بعد آپ کو کام دیں گے۔
عشاء کے بعد وہ واپس مسجد نبوی کے صحن میں آ گیا اور خوش تھا کہ روضہء رسول کی برکت سے اُسے جلد کام مل جائے گا۔
اب اصغر کے پاس کل پچاس ریال تھے۔ اُس نے خیال کیا اگر دو تین دن میں کام مل جائے تو وہ جدہ نہیں جائے گا، یہیں رہے گا اور صبح و شام روضہء رسول کی زیارت کرے گا۔ اس خیال سے وہ جھوم سا گیا اور اپنے جوتے مسجد نبوی کے دروازے پر اُتار کر اندر چلا گیا۔ دیر تک حرم ہی کے پاس بیٹھا رہا۔ رات دس بجے انتظامیہ نے جب مسجد نبوی تمام لوگوں سے خالی کروائی تو وہ بھی باہر نکل آیا اور جوتے ڈھونڈنے لگا مگر ہزار کوشش کے باوجود جوتے نہ ملے۔
رات اُس نے ننگے پاؤں ہی گزاری۔ وہ ایک پلازے کی دیوار کے ساتھ کپڑوں کا بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ دوسرے دن صبح کی اذان کے ساتھ جاگ گیا۔
آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے پاس ہی ایک لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اصغر نے اُس کے ساتھ آنکھوں کے اشارے سے سلام لیا اور پھر وہ دونوں مسجد میں آ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر باتیں کرنے لگے۔
کہاں کے رہنے والے ہو؟ لڑکے نے پوچھا۔
ساہیوال سے آیا ہوں، اصغر نے جواب دیا۔
آپ کے جوتے کہاں ہیں؟
رات کسی نے مسجد کے دروازے سے اُٹھا لئے ہیں، اصغر آہستگی سے بولا۔
کیا کوئی کام ملا؟ لڑکے نے پوچھا۔
ابھی نہیں، کسی نے وعدہ ضرور کیا ہے' اصغر نے کہا' اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟
میں رائے ونڈ کے ایک قصبے رلیہ جنگ کا ہوں۔ میرا نام نوید ہے۔ دو سال سے یہاں ہوں۔ آج کل کوئی کام بھی نہیں اور پیسہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ رات تمہیں سوتے ہوئے دیکھا تو سوچا، کستانی ہے، دوستی ہو جائے گی، ویسے کیا کر سکتے ہو؟
ٹائل، پلستر، پینٹنگ، شیشے کا کام اور معماری جیسا ہر کام کر لیتا ہوں، اصغر نے بتایا۔
اُحد پہاڑ کے دوسری طرف ایک بستی ہے' نوید کہنے لگا' وہاں ایک بنگالی میرا دوست

ہے۔ وہ بھی معماری کا کام کرتا ہے۔ اگر کام کرنا چاہو تو میں تجھے اُس کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ میرا خود بھی اُسی کے ساتھ مزدوری کرنے کا ارادہ ہے۔ دوسری سہولت یہ کہ شُرطوں کا اُدھر نام ونشان بھی نہیں۔ دس ریال میں ٹیکسی لے جاتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے جوتے بھی وہیں سے خرید لیں گے۔ مدینے کی نسبت وہاں کا بازار سستا ہے۔

صبح دس بجے سے پہلے وہ اُحد کی بستی میں پہنچ چکے تھے۔ ناشتہ اور ٹیکسی کا کرایہ دینے کے بعد اُس کے پاس صرف پندرہ ریال بچ گئے تھے۔ بنگالی گھر پر نہیں تھا۔ اس لئے شام تک اُس کا انتظار کرنا پڑا۔ اصغر نے چاہا کہ چھوٹے موٹے جوتے خرید لے تاکہ ننگے پاؤں کی خجالت سے بچے۔ وہ دونوں اس بستی کے ایک چھوٹے بازار میں گئے۔ مگر کوشش کے باوجود انہیں ایسا کوئی جوتا نظر نہ آیا جس کی قیمت پچیس ریال سے کم ہوتی۔ پتھریلی زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ سورج جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا، تپش سر کو پہنچنے لگی۔ دہکتے کنکر تلووں کو کاٹتے ہوئے اندر گھس جاتے۔ آخر وہ دونوں ایک کھجور کے سائے میں بیٹھ گئے۔ سہ پہر کے وقت اُس نے نوید کو پانچ ریال دیے کہ ہوٹل سے کھانا لے آئے۔ اس لئے کہ اب وہ ننگے پاؤں ہوٹل تک نہیں جا سکتا تھا۔ نوید کھانا لایا تو وہ کھانا کھا کر وہیں پر لیٹ گئے۔ حتیٰ کہ شام ہو گئی۔

میں آپ کو پچاس ریال فی یوم کی مزدوری دیا کروں گا۔ بنگالی نے پان کی رال منہ سے گراتے ہوئے کہا، ہاں کھانے اور رہائش کا تم سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ کام اگر تھراتہ کرو گے تو مزدوری کاٹ لی جائے گی اور چھٹی کے روز کا کھانا تم اپنی جیب سے کھاؤ گے۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ تمہاری مرضی، اور ہاں! ایک بات آپ کو بتاؤں، تمہیں کام پر لگانے کا خطرہ میں اپنی ذمہ داری پہ لے رہا ہوں۔

بنگالی کی باتوں کے دوران وہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ چٹائی بستر سمیت کھانے کے برتن جو نہایت گندے تھے، اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اُن سے ایک عجیب قسم کی اُلجھن ہو رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے بنگالی سمیت اتنی گندی اور بدبودار تھی کہ اُسے کراہت ہونے لگی اور جی اوبنے لگا۔ خاص کر جب بنگالی بات کرتا، پان سے آلودہ کالے سیاہ دانت اُسے ایک خوف میں مبتلا کر دیتے۔ وہ بجائے بنگالی کی شرائط پر کان دھرنے کے اسی بات پر غور کرتا رہا کہ یہاں رات کیسے کاٹی جائے؟

صبح ہوتے ہی اُس نے نوید کو جگایا اور بغیر بتائے چل دیے۔ ٹیکسی کا کرایہ نہ تھا لہٰذا بجائے پہاڑ کا چکر کاٹنے کے، اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اُتر جاتے ہیں اس طرح جلد ہی میدانِ اُحد میں پہنچ جائیں گے۔ پھر وہاں سے مسجد نبوی تین کلومیٹر پر ہی تو ہے۔ لیکن جب وہ کافی اونچا چڑھ گئے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ کام جتنا آسان سمجھ رہے تھے، کچھ ایسا سہل بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ سورج کی شعاؤں نے خشک پتھروں کو اس طرح تپا دیا کہ پاؤں رکھنا عذاب ہو گیا۔ اِدھر پہاڑ ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک چٹان ختم ہوتی تو سامنے دوسری آ موجود ہوتی۔ اصغر کے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ جلن کی شدت تکلیف دے رہی تھی۔ خدا خدا کر کے دو بجے سہ پہر وہ چوٹی پر پہنچے لیکن اب اُترنا چڑھنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ہر طرف بکھرے ہوئے نوکدار گرم پتھر اور کنکر دیکھ کر اُس کا دل سہم گیا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تو بہت تھیں لیکن سایا نام کو نہیں تھا۔ اُس پر ستم یہ کہ پیاس اور دھوپ کی شدت نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آخر اُس نے نوید سے کہا، 'بھائی میں تو اب نہیں چل سکتا اور ایک چھوٹی سی غار میں ڈھیر ہو گیا'۔ جس کے پاس ہی ببول کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ کافی دیر لیٹے رہنے کے بعد درد کی ایک شدید لہر سے، جو اُس کے پاؤں سے اُٹھی، اصغر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو اب سُوج چکے تھے اور تلوؤں کے اندر چھوٹی کنکریاں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ جنہیں ہاتھ لگانے سے بھی درد کی لہریں اُٹھتی تھیں۔ کچھ دیر وہ اپنے پاؤں کو نرمی سے سہلاتا رہا۔ دُور سے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ شمال کی سمت سے مسجد نبوی کے مینار بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل چار گھنٹے سوئے تھے مگر اب بھوک اور پیاس اپنا کام دکھانے لگی پھر بھی اُنہوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ چاند مشرق کی طرف سے اُبھر آیا تھا۔ پتھروں میں گرمی قدرے کم ہو چکی تھی اور خشک پہاڑوں کے سکوت میں نرم ہواؤں کا لمس بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے پھوٹ بہے تھے جن سے اب خون بہنے لگا تھا لیکن پہاڑ کے اوپر چاند کے سایے میں وہ اپنا سفر ملتوی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مسلسل چلتے رہے، لیکن کہاں تک؟ بھوک اور پیاس کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آخر گیارہ بجے کے قریب وہ ایک جگہ پھر لیٹ گئے۔ اصغر کے پاؤں اب اس قدر چھلنی ہو چکے تھے کہ جس پتھر پر رکھتا وہ رنگین ہو جاتا۔ درد کی ٹیسیں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے

اُس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

آنکھ کھلی تو اصغر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شبنم کے قطروں سے چہرہ بھیگ چکا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر کی لیکن نوید وہاں نظر نہ آیا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد آواز دی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا تھا۔ اصغر نے چھلنی اور سوجے ہوئے پاؤں کے ساتھ اُٹھ کر چلنے کا ارادہ کیا لیکن جیسے ہی بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا، اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ کپڑوں والا بیگ وہاں موجود نہیں تھا، جس میں اُس کا پاسپورٹ اور دوسرے کئی کاغذات تھے۔ پھر غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا، لیکن وہ بھی خالی تھی۔ نوید اُس کا بیگ اور دس ریال کی پونجی لے کر جا چکا تھا۔ اِدھر پہنے ہوئے کپڑے گرد اور پسینے سے اتنے گندے ہو چکے تھے کہ اُسے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہوئی۔

وہ خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ گرتا پڑتا تین گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد پہاڑ سے نیچے اُترا۔ پیاس کی وجہ سے جان نکلی جا رہی تھی۔ اُس نے پانی کے لئے بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک ایک لوہے کا ٹینکر نظر آیا۔ قریب ہی بکریوں کا ایک باڑا تھا۔ باڑے میں سوکھی گھاس کے گٹھے پڑے ہوئے تھے، جنہیں بکریاں کُتر کُتر کے کھا رہی تھیں۔ اصغر نے بے تابی سے ٹینکر میں ہاتھ ڈالا اور بکریوں کا استعمال شدہ پانی اوک سے حلق میں اُنڈیل لیا۔ پانی اتنا گرم تھا کہ وہ سینے کو چیرتا ہوا معدے میں اُتر گیا۔ معدے میں اُس نے مزید آگ لگا دی۔ آنکھیں اُبلنے لگیں۔ کسی طرح سے اصغر نے میدانِ اُحد کا رخ کیا۔ اپنے تمام حواس کو مجتمع کرتے ہوئے، جس قدر ہو سکتا تھا تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کی۔ میدان کے قریب پہنچا تو سامنے والے گھر کے دروازے پر ایک دس بارہ سال کا لڑکا نظر آیا۔ وہ جلدی سے دیوار کے سایے میں گر گیا اور بچے کو اشارے سے پانی کے لئے کہا۔ ٹھنڈے پانی سے پیٹ بھر کر اُس کی جان میں جان آئی۔ ابھی وہ لڑکے کو کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ بالآخر نقاہت اور کمزوری کے ساتھ وہ زخمی پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسجد امیر حمزہ میں داخل ہو گیا اور منہ پر اچھی طرح سے پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر دیوار کے ساتھ بیٹھ کر پاؤں کو سہلانے لگا۔ بھوک نے اب اُسے بے بس کر دیا تھا لیکن کسی سے مانگنے کی نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ وہ جلد کسی نہ کسی طرح کھانے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا مگر ننگے اور زخمی پاؤں کے ساتھ دھوپ میں نکلنے کے تصور سے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے۔ سوجے ہوئے پاؤں سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھا کہ کیا کرے؟ اتنے میں عصر کی اذان ہو گئی اور لوگ نماز کے لئے آنا شروع ہوئے۔ وہ کچھ دیر نمازیوں کو آتے ہوئے غور سے دیکھتا رہا جو اُسے ایک اچٹتی نظر اور بے نیازی سے دیکھ کر گزر جاتے۔ اُسی لمحے اُس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال بجلی کی طرح کوندا۔ وہ جلدی سے لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا، ایک عربی نہایت نفیس لباس میں آیا اور اپنے جوتے مسجد کے دروازے کی بیرونی چوکھٹ پر اُتار کر اندر داخل ہو گیا۔ جوتے بہت عمدہ چمڑے کے تھے۔ اعرابی کے مسجد میں داخل ہوتے ہی اصغر اُس کے جوتے پہن کر تیزی سے مڑا لیکن دروازے کے پاس کھڑے چوکیدار نے اُسے پکڑ لیا اور سارق سارق کی آواز بلند کر دی۔ تمام لوگ دوڑ آئے۔ جیسے کوئی اچانک تماشا لگ جائے۔ کسی نے تھپڑ اور کسی نے لات ماری۔ اعرابی نے بڑھ کر اُس کی گردن دبوچ لی۔ دو لوگوں نے مل کر مشکیں کس دیں۔ وہ سب اُسے عربی میں نہ جانے کیا کیا پوچھتے رہے، جن کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ بھوک سے نڈھال ہونے کی وجہ سے کچھ سُن بھی نہیں رہا تھا۔

جنابِ عالی! میری آنکھوں کے سامنے اِس بد بخت نے شریف نمازی کے جوتے چرائے ہیں۔ یہ دونوں عادل گواہ اور اِن کے علاوہ دوسرے بھی کئی لوگ موقع پر موجود تھے۔ چوکیدار شرعی عدالت میں گواہی دیتے ہوئے بولا۔ چوکیدار کے بعد شاہدین نے باری باری گواہی دی۔

لیکن ملزم کو صفائی کا موقع ملنا چاہیے۔ قاضی نے ترجمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم نے جوتے نہیں چرائے؟ ترجمان نے اُسے زور دے کر پوچھا۔

مگر ترجمان کے تین بار پوچھنے پر بھی وہ آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ دراصل اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کانوں میں فقط سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ بلکہ اُسے اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کو یہاں کس لئے لایا گیا ہے؟

ملزم کی خاموشی اور خستگی کی وجہ سے قاضی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک عادی مجرم اور پیشہ ور چور ہے۔ بالآخر عدل اور شرعی قانون کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قاضی نے اپنا فیصلہ سنا دیا جسے مجرم

کے علاوہ تمام لوگوں نے سنا اور تحسین کی۔

صبح کی اذان کے بعد جب اُسے ہاتھ کاٹنے کے لئے بندی خانے سے باہر لایا گیا تو وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک ماہر کاری گر ہے۔ حتیٰ کہ اُسے اپنے بوڑھے باپ کی شکل بھی یاد نہ رہی تھی۔

madblib.org

مولوی کی کرامت

مولوی عبدالرحمٰن کے قصبے میں قدم رکھنے کے تیسرے دن بعد ہی یہ بات کھل گئی تھی کہ مولوی صاحب جلالی آدمی ہیں۔ تحصیلدار کے لڑکے کو پڑھاتے ہوئے ایسے زور کا تھپڑ مارا، بیچارے کا کان پھٹ گیا، جس پر تحصیلدار کا دس ہزار خرچ آیا اور جب اس نے مولوی صاحب سے شکوہ کیا تو غریب کے سر پر عصا دے مارا۔ ایک بڑا ہنگامہ کھڑا ہونے لگا مگر اہلِ قصبہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا لیکن اس بات کی خبر تو بعد میں ہوئی کہ حضرت صاحب صاحبِ کرامت بھی ہیں۔

پہلا واقعہ تو حاجی امانت کو پیش آیا جس کی حویلی مسجد کے پچھواڑے میں تھی۔ حویلی کے ایک حصے میں بھینسوں کا باڑا تھا جو کپاس کی سوکھی چھڑیوں سے باڑ کر کے گھیرا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے لئے روزانہ ایک کلو دودھ حاجی امانت کے ہاں سے جاتا۔ ایک روز حاجی صاحب کی بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ آئی اور دو دن تک رہی۔ ان دو دنوں میں مولانا کو دودھ نہ گیا۔ شاگرد کو بھیجا تو وہ نامراد لوٹا۔ اب جو مولوی عبدالرحمٰن کو غصہ آیا تو منہ سے بددعا نکل گئی۔ کہنے لگے 'حاجی کے باڑے کو آگ لگ گئی تو پھر بیٹی دودھ کہاں سے پیے گی اور اسی رات باڑے کو آگ نے لپک لیا۔ آگ اس تیزی سے پھیلی کہ بجھائے نہ بجھی اور حاجی کی چار بھینسیں جل مریں۔ اس واقعے نے بہت سے لوگوں کو مولوی کی ولایت کا یقین کروا دیا۔ سوائے رضا علی کے، کہ وہ ہر معاملے میں شکی واقع ہوا تھا۔ اُس نے یہ شوشہ چھوڑا کہ یہ مولوی صاحب کے کسی شاگرد کی کارستانی ہے مگر جب لوگوں نے اس کا منہ پھٹکارا تو وہ بے شرمی سے چُپ ہو گیا۔ اب اس واقعے کو دو ہی مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک اور غضب ہو گیا۔ جلال بخش کا چھوکرا پتنگ کے پیچھے دوڑتا آیا اور روا روی میں مولوی عبدالرحمٰن کے مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اب ظاہر ہے مولوی صاحب کے گھر والے سخت

پردہ دار تھے۔ لونڈے کو چھت پر یوں دندناتے دیکھا تو مولویانی صاحبہ دوہتھڑ پیٹنے لگی۔ ہائے یہ کون کم بخت ہماری بے آبروئی پر آمادہ ہے۔ مولوی صاحب نے آواز سنی تو کمرے سے صحن میں دوڑے۔ جونہی لڑکے کو چھت پر دیکھا تو تلووں میں جا لگی اور غصے سے جسم کانپنے لگا۔ عصا تھامے سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ ادھر بے حیا نے جلدی سے کنکوا پکڑا اور اگلی چھت پر کود گیا۔ اب حضرت صاحب کا غصہ دوچند ہو گیا کہ ایک تو گھر والی بے پردہ ہوئی اور مجرم بھی صاف بچ نکلا۔ بے چارگی کے عالم میں بلند آواز میں بددعائیں دینے لگے" خدا کرے تیری ٹانگ ٹوٹے۔ او! نامراد تیری آنکھیں پھوٹیں، تو ہمیں بے آبرو کرنے نکلا۔ خدا تجھے بستر پر دراز کرے"۔

لڑکا ایک کے بعد ایک چھت پھلانگتا گیا اور مولوی صاحب گالیاں دیتے گئے۔ اچانک ایک دیوار پر لونڈے کا پاؤں توازن کھو گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ گرتے ہی بائیں ٹانگ سے چٹاخ کی آواز آئی۔ مولوی صاحب نے برے کو انجام تک پہنچتے دیکھا تو خوش ہو کر خضاب شدہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور نیچے اُتر کر بخاری شریف کے باب الغسل کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اُدھر پورے محلے میں مولوی صاحب کی کرامات کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہر فرد تو بہ تو بہ بول اُٹھا۔ بہت لوگوں نے لڑکے کو مزید کوسنے دیے کہ کیوں اُس نے ایک اللہ والے کے گھر نظر ڈالی۔ ان چھوٹے موٹے واقعات سے پچھلے دو برسوں میں مولوی عبدالرحمٰن نے قصبے والوں پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ عام مولوی نہیں ہے، جسے کوئی کمین سمجھ لیا جائے۔ وہ جان گیا تھا کہ صراط مستقیم پر ہونے کی وجہ سے خدا نے ہمیشہ اُس کا پورا ساتھ دیا۔ فخر کی شادی پر تو مولوی صاحب کی ولایت پر مہر لگ گئی۔ ہر شخص سہم گیا۔ بعض تو انہیں دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ پاس سے گزرنے والا ہر آدمی جھک کر سلام کیے بغیر نہ نکلتا مبادا مولوی صاحب ناراض ہو کر بددعا داغ دیں۔ اگرچہ فخر کی سزا سخت تھی۔ مولوی صاحب کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن دیکھا جائے تو مولانا حق بجانب تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ پچھلے دس دن سے اس شادی کے ہنگامے نے پورے محلے کی نیندیں حرام کر دیں۔ روز کی آتش بازی اور ڈھول تاشوں کے شور نے مُردوں تک کے کان نوچ ڈالے اور تو اور جمعہ کا خطبہ بھی نہ خود سنا اور نہ کسی کو سننے دیا۔ بس یہی بات تھی جو مولوی عبدالرحمٰن کی رنجیدگی کا باعث ہوئی اور دورانِ خطبہ اُن کے منہ سے نکل گیا" ڈھول بند نہ کرنا، دلہن چاہے رستے میں ہی رنڈی ہو جائے"۔ بس یہ کہنا تھا کہ ہر طرف سراسیمگی چھا گئی۔ اب کس کی جرأت تھی جو مولوی صاحب سے رحم کی اپیل

کرتا۔ تیسرے دن برات گئی اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ واپسی پر دولہے کی کار کو ٹرک نے کچل دیا۔ فخر خاں اور ڈرائیور کی ایک ساتھ ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور دلہن چھ ماہ تک ہسپتال کے بیڈ سے لگ گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مولوی صاحب نے بقول اُن کے اپنی بددعا میں تخفیف کر دی تھی، اسی لئے ان کی جان بچ گئی۔

لیکن ایک بات جو پورے قصبے کے لئے حیرانی کا سبب تھی وہ یہ کہ مولانا صاحب کی دعا قبول نہ ہوتی بلکہ بعض اوقات اُلٹا اثر دکھاتی۔ رانا فاروق نے نماز فجر کے بعد مولوی صاحب سے استدعا کی کہ اُس کے والد کے لئے دعائے صحت کر دیں۔ رانا فاروق صاحب ثروت آدمی تھا لہٰذا مولوی عبدالرحمٰن نے جو گڑ گڑا کر دعا مانگنا شروع کی تو آدھ گھنٹا تک کھینچ کر لے گئے اور ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ رانا کا چھوٹا بھائی ابا کی موت کی خبر لے کر مسجد میں پہنچ گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ اہلِ قصبہ کے کہنے پر مولانا نے بارش کے لئے دعا کی مگر ایسا سوکھا پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اُٹھی۔

خیر یہ ایسے واقعات نہیں تھے جو مولوی عبدالرحمٰن کے لئے کسی خرابی کا باعث بنتے اور قصبے والوں کو بدگمان کرتے۔ ویسے بھی قصبے کی زیادہ آبادی نظریاتی سطح پر مولانا کی موافق تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو تنظیموں کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا علم بھی قصبے والوں کو خوب تھا۔ قربانی کی کھالیں اور سالانہ چندے مولوی صاحب اُن کے لئے اکٹھا کرتے تھے۔ ایک دو لوگوں نے ایک دفعہ چندہ نہ دے کر کفر کا ارتکاب بھی کیا مگر جلد ہی جہادی تنظیموں کے زورِ بازو اور مولانا کی نصیحت نے انہیں صراطِ مستقیم پر دوبارہ لا کھڑا کیا۔

اسی طرح مولانا نے پورے قصبے کو تین سال کے اندر صحیح دین کی تبلیغ کی۔ نماز کے فوائد، جہاد کی فضیلت اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی کا تمام فلسفہ سمجھا دیا۔ یوں قصبے والے اور مولوی صاحب آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور زندگی آرام سے کٹنے لگی کہ ایک چھوٹے سے واقعے نے مولوی صاحب کی سانس اُکھیڑ دی۔

ہوا یہ کہ وہی رانا فاروق جس کے باپ کی دعائے صحت مولانا نے کی تھی، اُس کا گھر عین مولانا کے سامنے واقع تھا۔ کچھ دن پہلے کم بخت نہ جانے کہاں سے ایک بلڈریا کتا اُٹھا لایا۔ اُس نے آتے جاتے مولوی عبدالرحمٰن پر بھونکنا شروع کر دیا۔ اِدھر مولوی صاحب میں کچھ عرصے سے وضع داری پیدا ہو چلی تھی کیونکہ مولوی صاحب کے گھر کا تمام خرچ یہی رانا فاروق

صاحب اُٹھاتے تھے۔ لہٰذا کتے کو کچھ کہتے ہوئے حیامانع ہوتی۔ بہت دن تک صبر کیا لیکن کتے کی بدمعاشیاں روز بروز بڑھتی چلی گئیں۔ اب بھونکنے کے ساتھ ساتھ وہ نامراد مولوی صاحب کی ٹانگوں سے بھی ٹکرانے لگا اور کپڑے ناپاک کر کے رکھ دیتا۔ انہوں نے کئی دفعہ سختی سے اور کئی دفعہ پیار سے سرزنش بھی کی مگر کتا تھا کہ اپنی دم کی طرح ٹیڑھا سیدھا ہونے میں نہیں آتا تھا۔ مولانا صاحب نے ایک دو دفعہ رانا فاروق سے ہلکی سی شکایت بھی کی مگر وہ ہنس کر ٹال گئے۔ جس پر مولوی کو اپنے آپ پر شدید غصہ آیا کہ کاش اس نے تین سال تک رانا فاروق کی روٹیاں نہ کھائی ہوتیں اور دل ہی دل میں ہزار ہا بددعائیں کتے کی موت کے لئے کر دیں۔ ایک دو دفعہ جمعے کے خطبے میں بھی مولوی عبدالرحمٰن نے کتے کی نجاست کے سلسلے میں زوردار تقریر کی اور کہا، جس گھر میں یہ ناپاک جانور ہو وہاں فرشتوں کا گزر نہیں ہوتا مگر رانا فاروق پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دو مہینے تک مولوی صاحب مسلسل دل ہی دل میں روزانہ ہر نماز کے بعد بددعائیں کرتے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اُلٹا کتے نے ایک اور کام شروع کر دیا کہ جب بھی مولانا صاحب اذان دینا شروع کرتے، کتا بھونکنا شروع کر دیتا۔ یہ بات پہلے سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی۔ دوسری تشویش مولوی صاحب کو یہ لاحق ہوئی کہ آخر ان کی بددعائیں کیوں بے اثر جارہی ہیں؟ ان باتوں کی وجہ سے مولوی صاحب کی طبیعت میں پچھلے کئی دنوں سے ایک چڑچڑاپن پیدا ہو گیا۔ بات بات پر لوگوں کو ڈانٹتے اور شاگردوں کی تو گویا جان کا عذاب ہو گئے۔ ادھر کسی سے ایک زیر زبر کی غلطی ہوئی نہیں کہ بیچارے کو اُدھیڑ کے رکھ دیا۔

آج کتے کو مولوی صاحب کے پڑوس میں آئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ ان تین مہینوں میں مولوی عبدالرحمٰن کی زندگی کا سارا لطف غارت ہو کر رہ گیا۔ حرام زادے نے ایک جبہ اور دو شلواریں پھاڑیں۔ کپڑے تو روزانہ ہی پلید کرتا تھا۔ جب چاہتا گھر میں گھس آتا۔ کئی برتن ناپاک کئے۔ خیر یہ سب کچھ تو گوارا تھا مگر یہ کون سی شرافت تھی کہ اُدھر مولانا اذان کو کھڑے ہوئے اِدھر یہ شیطان بھونکنے لگا۔ صبر کی آخر حد ہوتی ہے اور آج مولوی صاحب نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جیسے ہی مولوی عبدالرحمٰن گھر لوٹے، ہلٹر یا مولانا کی ٹانگوں کی طرف بھونکتا ہوا دوڑا اور دانتوں سے کپڑے کھینچنے لگا۔ آج مولوی صاحب نے بجائے مارنے کے اُسے پچکارا اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ مولویانی صاحبہ یہ دیکھ کر دنگ رہ

گئی کہ آخر مولوی صاحب کو کیا ہوا؟ جانے کتے کو کمرے میں کیوں لے گھسے۔ ادھر مولوی عبدالرحمٰن نے کتے سمیت اندر گھستے ہی دروازے کو کنڈی چڑھادی اور لوہے کا نوکدار سریا پکڑلیا جو کل نظام دین لوہار سے بنوا کر لائے تھے۔ جب گلٹریا نے مولوی کے تیور دیکھے تو وہ بھونکتا ہوا ادھر اُدھر کونوں میں دوڑنے لگا لیکن اب حضرت صاحب بھی اپنی آئی پر آئے ہوئے تھے۔ کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ اندر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور کمرے کی چیزیں ٹوٹنے پھوٹنے لگیں۔ اسی دوڑ دھڑپے اور آپادھاپی میں کتے کو ایک سریا جا لگا اور اس کی ٹانگ سے خون نکلنے لگا۔ کتا ہر ممکن جان بچانے کی فکر میں تھا لیکن بھاگنے کو رستہ نہیں مل رہا تھا اور موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ دوسری طرف مولویانی صاحبہ باہر کھڑی دروازہ پیٹنے لگی۔ محلے والے شور تو سن رہے تھے مگر گھر میں داخل ہونے کی جرات کسی میں نہیں تھی کیونکہ پردہ بہت سخت تھا۔

اندر جب کتا نڈھال ہو چلا اور اسے اپنی موت نظر آنے لگی تو کمبخت نے ایک عجیب کام کیا۔ ایک بھرپور چھلانگ لگا کر سیدھا مولوی صاحب کی شہ رگ پر حملہ کر دیا۔ مولوی نے فوراً اپنا بایاں ہاتھ کتے اور اپنی گردن کے درمیان کر دیا۔ یوں کتے نے اپنے دانت مولوی صاحب کی بائیں کلائی میں گاڑ دیے۔ درد کی شدت سے ایک دم مولوی کی چیخ نکلی لیکن پھر فوراً ہی دائیں ہاتھ سے کتے کی کمر پکڑ کر مولوی عبدالرحمٰن نے اپنے دانت کتے کی گردن میں پیوست کر دیے۔

یوں مولوی اور کتا پنجوں اور منہ، دونوں طرف سے مصروف ہو گئے اور کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ باہر مولویانی صاحبہ نے جب اس طرح اچانک خموشی دیکھی تو مزید فکر مند ہو گئیں کیونکہ اگر کتا مر گیا تھا تو مولوی صاحب کو دروازہ کھول دینا چاہیے تھا۔ جب خموشی نے طول کھینچا اور دروازہ بھی نہ کھلا تو بیچاری نے دو ہتھڑ دروازہ کوٹنا شروع کر دیا اور شور مچا کر لوگوں کو پکارنے لگی۔ مولویانی صاحبہ کی پکار پر باہر کھڑا مجمع سیلاب کی طرح اندر آ گیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ دروازے کے دوسری طرف مولوی عبدالرحمٰن کتے کے ساتھ بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ اس کی بائیں کلائی کتے کے منہ میں تھی جب کہ دائیں ہاتھ سے مولوی صاحب نے کتے کو پکڑ رکھا تھا اور اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ رکھے تھے۔ لہٰذا نہ تو ہاتھوں سے دروازہ کھول سکتے تھے اور نہ منہ سے بول سکتے تھے۔

باہر جب لوگ دروازہ کھٹکھٹا کر تھک گئے تو انہوں نے دروازہ توڑ دیا۔ دروازہ ٹوٹتے

ہی ایک ہولناک منظر سامنے تھا۔لوگ دم بخود رہ گئے۔لوگوں نے بڑی مشکل سے آگے بڑھ کر مولوی عبدالرحمٰن اور کتے کو ایک دوسرے سے چھڑایا۔کتا اور مولوی صاحب ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد نڈھال ہو کر گر پڑے۔مولانا کی کلائی اور کتے کی گردن سے خون جاری تھا۔ رانا فاروق نے جلدی سے اپنا کتا اُٹھایا اور اُسے اینمل ہاسپٹل لے گیا۔ادھر مولانا کی کلائی پر مرہم پٹی ہونے لگی۔

حادثے کے چوتھے دن جب رانا فاروق کے کتے کے مرنے کی خبر پھیلی تو قصبے میں ایک عجیب قسم کا خوف پھیل گیا۔گلی گلی میں مولوی صاحب کی جلالت کے تذکرے ہونے لگے۔آؤ بھگت دو چند ہو گئی اور ایسی دھاک بیٹھی کہ پھر قصبے میں کوئی فرد مولوی عبدالرحمٰن کے سامنے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے قابل نہ رہا۔

مومن والا کا سفر

گھوڑے کی ڈِگی چال سے تانگے میں ایک ردھم پیدا ہو گیا اور وہ دھلکو دھلکو کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ نہر کی پٹڑی پر دونوں طرف کھڑے شیشم اور پیپل کے اونچے اونچے درختوں نے سورج کا راستہ اس طرح روکا کہ دھوپ کی ایک کرن بھی سڑک پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ بعض درختوں کی شاخیں جھک کر نہر میں چلتے پانی کو چھو رہی تھیں اور بارشوں کے باعث ہوا میں ایک سحر زدہ خنکی تھی۔ اگرچہ "مومن والا" دو ہی کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نذیراں کے برعکس میری اور اختر کی خواہش تھی کہ تانگا شام تک یونہی دھلکو دھلکو چلتا رہے اور ہم جھولے لیتے رہیں۔ درختوں کی بعض شاخیں اور پتے جب ہمارے چہروں سے ٹکراتے تو ٹھنڈک سینے کے اندر تک اُتر جاتی۔ ہمیں نہ تو نذیراں کے مقصد سے سروکار تھا اور نہ ہی ان بگلوں کی پرواہ تھی جنہیں ہم ٹوکرے میں بند کر کے تانگے پر لادے "مومن والا" لے کے جا رہے تھے لیکن ٹھہریں! مناسب ہے کہ میں اس کہانی کے پس منظر سے تھوڑا سا آپ کو آگاہ کر دوں۔

ہمارا گاؤں انگریزی منصوبے کے تحت ماڈل ویلج تھا جس میں ڈاکخانہ، سکول، ہسپتال، یونین کونسل اور اسی طرح کی تمام شہری سہولتیں موجود تھیں۔ خاص ہمارے گھر کے سامنے یونین کونسل کا دفتر تھا، جس میں اونچے اونچے سینکڑوں درخت جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ خدا معلوم کس وقت سارے جہان کے بگلوں نے انہیں اپنا مسکن بنا لیا۔ شروع شروع میں تو بگلوں کی آمد بڑی اچھی لگی۔ درختوں پر گویا برف کے سفید گالے جا بجا بکھرے پڑے ہوں، جب برسن اور دھان کو پانی لگتا تو یہ ٹولیاں کی ٹولیاں کھیتوں پر ایسے اُترتیں جیسے پریوں کے اکھاڑے ہوں اور رات کے وقت شاخوں پر ذرا سا ہلنے میں عجب طرح کی کھڑ کھڑاہٹ ہوتی جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک

ساز بجاتی چلی جاتی لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ ان کی ہمسائیگی اتنی بھی خوش کن نہیں جیسی ہم نے خیال کی تھی بلکہ زحمت ہے۔ جدھر دیکھو بیٹیں ہی بیٹیں اور بارشوں میں اس قدر بدبو پھیلتی کہ سانس لینا عذاب ہو جاتا۔ ایک طرف تو یہ وبال، دوسری طرف بال و پر اس قدر بکھرتے کہ آس پڑوس کے کھانے پینے کی اشیا بھی مشکوک ہو جاتیں۔ محلے والوں اور چیئر مین کونسل کے باہمی مشورے سے درختوں کی شاخیں کاٹنے کا فیصلہ ہوتا کہ بگلے اپنا ٹھکانہ بدل لیں۔ لیکن اس عمل میں ایک خرابی تھی کہ بگلوں کے سینکڑوں بچے بارہ مہینے پیدا ہوتے رہتے، جو اُڑ نہ سکتے تھے۔ اور ان کی جان کو خطرہ تھا مگر کب تک کوئی ان کے بارے میں سوچتا۔ یوں بھی اس دفعہ مون سون کی بارشوں نے وہ اُودھم مچایا کہ کچی دیواریں اور مکان ایک کر دیے اور بگلوں کی بدبو اتنی پھیلی کہ الاماں۔ بیماریاں پھوٹ پڑنے کا خدشہ ہو گیا۔ لہٰذا درختوں کی چھوٹی بڑی شاخیں کاٹ دیں جس کی وجہ سے تمام بگلے اُڑ گئے۔ گھونسلے بکھرے تو بگلوں کے بچے گر گر پڑے۔ بہت سے تو گرتے ہی مر گئے۔ جدھر دیکھتے سینکڑوں پرندے بکھرے پڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لاشیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتیں۔ کیا سڑکیں اور کیا یونین کونسل کا صحن، ایک مقتل کا نقشہ دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص گزرتا انہیں دیکھ کر رو پڑتا کہ اس سے پہلے گاؤں والوں نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ جو بال و پر نکالے ہوئے تھے وہ ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے، جیسے اپنی جانیں بچانے کے لئے ٹھکانہ ڈھونڈتے ہوں۔

نذیراں کو خبر ہوئی تو بھاگتی ہوئی آئی، ایک بڑا ٹوکرا ہاتھ میں تھا۔ میں اور میرا چچا زاد نیکریں پہنے ننگ دھڑنگ کھیل رہے تھے۔ ہمیں حکم ہوا کہ جلدی سے بگلوں کے بچے پکڑ کے ٹوکرے میں ڈالو۔ ہمیں تو کھیلنے کو ایک کام مل گیا۔ بھاگ بھاگ کر بگلوں کے بچے پکڑنے لگے۔ ہماری بلا سے کہ اس کا کیا مقصد ہے۔

اصل میں ہمارا گاؤں ارد گرد کے دس پندرہ گاؤں کا مرکز تھا، جس کی یونین کونسل کے لئے ایک چیئر مین بذریعہ ووٹنگ منتخب ہوتا۔ اس دفعہ "مومن والا" کا لال دین منتخب ہوا۔ "مومن والا" ہمارے گاؤں سے اڑھائی کلومیٹر دور نہر کے کنارے واقع تھا۔ نذیراں، جسے تمام گاؤں نے ایسے ہی مفت کی ممبری دی تھی۔ گاؤں میں کوئی نہ کوئی شغل یا ہنگامہ کھڑا کیے رکھتی۔ ہر پنچائیت میں کرسی بچھائے سب سے آگے بیٹھتی۔ کہیں شادی بیاہ ہو، میت اٹھی ہو یا لڑائی جھگڑا، یہ برابر شریک ہوتی اور میلے ٹھیلوں سے لے کر، ناجائز بچے کی پیدائش تک میں ملوث رہتی۔ جھوٹ بولنے میں ایسی ماہر

کہ آپ کسی کا نام لے لیجیے، یہ اس کی سات پشتوں تک اپنی رشتہ داری گنوا دے گی۔ کہیں کوئی دعوت ہوتی، یہ بن بلائے جا دھمکتی اور اتنا کھاتی کہ گھر والے ہائے ہائے کہہ اُٹھتے۔

لال دین چونکہ نذیراں کی مخالف پارٹی کا تھا لہٰذا جب دفتر میں آ کر براجمان ہوتا تو اس کی چھاتی پر سانپ پھر جاتا۔ جو اصل ممبر تھے انہیں تو تکلیف ہوتی مگر نذیراں کی ''مدعی سست اور گواہ چست'' والی حیثیت تھی۔ بڑھ چڑھ کر اپنے کو پانچوں سواروں میں رکھتی۔ اب جو درختوں کی شاخیں کاٹی گئیں تو لڑائی کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

''ہائے کافر کے بچے نے مخلوقِ خدا پر کیا ستم ڈھایا۔ دیکھو تو کتنا ظلم ہوا، اب تو گاؤں پر عذاب گر کے رہے گا۔ میں کہتی ہوں یا اللہ جس طرح اس نے تیری ننھی ننھی جانوں کو مارا، تُو بھی اسے ایسے ہی دربدر کر کے مار۔''

غرض لال دین کو موٹی موٹی گالیاں دیے جاتی اور ہمارے ساتھ مل کے بگلوں کے بچے پکڑ کر ٹوکرے میں ڈالتی جاتی۔ جب ٹوکرا بھر گیا تو تانگے والے کو بلا بھیجا۔ اس وقت ہم کوئی دس برس کے ہوں گے۔ کہنے لگی چلو لڑکو! بگلے لالو کے گھر چھوڑ کے آئیں۔ حرامی جب انہیں پالے گا تو مزا آ جائے گا۔ ٹوکرے کے اوپر بڑا سا کپڑا باندھ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھ لیا۔ اگلی سیٹ پر نذیراں پھسر گئی اور ہمیں ہودے میں بٹھا لیا۔

تانگا جیسے ہی نہر کے پل پر پہنچا تو نذیراں کی آواز تیز ہو گئی، جو پہلے ہی کافی اونچی تھی۔ یہاں تک کہ لال دین کے گھر کے سامنے تانگا رُک گیا۔ ہم دونوں نے تو ایک ہی جھٹکے میں چھلانگ مار دی، جبکہ نذیراں کو اُترنے میں کافی دیر لگی کہ جسم ایک موٹی تازی بھینس کے برابر تو ضرور ہو گا۔ پھر بڑے آرام سے ٹوکرا کھول کر نیچے رکھا گیا۔ اور لال دین کے دروازے پر دستک دے دی۔

کچھ ہی دیر میں لال دین دھوتی پہنے باہر آیا اور نذیراں کو دیکھ کر حیران رہ گیا پھر بڑی گرم جوشی سے آگے بڑھ کر بولا ''اے نذیراں تجھے خدا اُٹھائے آج تو یہاں میرے گھر کیسے پہنچی؟''

نذیراں دایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے ایک دم بھڑک کے بولی! لال دین، میں نے سوچا آج تیرے ساتھ دو ہاتھ کر ہی آؤں۔ درختوں کی شاخیں کاٹتے وقت تجھے موت نہ آئی۔ ہائے اللہ یہ ظلم تو میری جان کو کھا گیا۔ ہزار جانیں مر گئیں۔ کیا دودھ ایسے سفید فرشتوں کو مار

دیا۔ خدا تیرا بیڑا غرق کرے۔ دیکھ اب میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ خدا کی قسم تجھے گاؤں میں گھسنے دوں تو شہاب دین کی بیٹی نہیں۔ تو تو بنگلے مار کر آرام سے بیٹھا ہے۔ اُدھر ہمارے گاؤں پر خدا کا قہر نازل ہو گیا۔

لال دین معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر جلدی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے جانے کے چند ثانیوں بعد ایک لڑکا اندر سے رنگین پایوں والی بڑی چارپائی اُٹھا لایا۔ چارپائی ڈیوڑھی میں بچھا کر ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ڈیوڑھی کے سامنے سے صاف پانی کی ایک ندی گزرتی تھی، جس کے کناروں پر نیم کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں دور تک بھینسیں بندھی تھیں۔ شاید ان میں سے کچھ بھینسیں لال دین کی بھی ہوں۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ لال دین سفید کرتے اور جامنی رنگ کا لاچا باندھے حقہ لے کر دوبارہ باہر آ گیا۔

اس نے حقہ نذیراں کے آگے رکھ دیا مگر نذیراں کا پارہ سو ڈگری سے اوپر تھا۔ مسلسل گالیاں دیتی رہی اور حقے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ لال دین تحمل سے گالیاں سنتا رہا اور بجائے غصے ہونے کے ہنستا رہا۔ جب نذیراں گالیاں اور طعنے دیتے دیتے تھک گئی اور خاموش ہوئی تو لال دین آہستہ سے بولا!

نذیراں! یہ تو میں جانتا ہوں کہ ہماری پوری یونین کونسل میں تیرے جیسا عقل مند کوئی نہیں۔ جتنا کام گاؤں والوں کے لئے تو نے کیا اُس کی کوئی مثال نہیں۔ میں جس قدر تیری عزت کرتا ہوں وہ میرا دل جانتا ہے۔ اب تو جو چاہے سمجھ البتہ درختوں کی شاخیں کاٹنے میں مجھ سے زیادہ تیرے اپنے گاؤں کے لوگوں کا ہاتھ ہے لیکن پھر بھی تو جو سزا دینا چاہے مجھے قبول ہے۔

لال دین نے بات کچھ ایسی ملائمت سے کی کہ نذیراں خود بخود نرم پڑ گئی لیکن حقہ گڑ گڑاتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی بھی رہی اور لال دین کو بھی کوستی گئی۔ لال دین مسلسل ہنس کے ٹالتا رہا کہ اتنے میں وہی لڑکا میٹھی لسی کا ایک بڑا جگ لے آیا۔ اول تو نذیراں نے لسی پینے سے انکار کر دیا مگر لال دین کے مسلسل اصرار پر وہیں بیٹھے تین گلاس پی گئی کہ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت، لسی کچھ زیادہ ہی مزا دے گئی تھی۔ نذیراں کے بعد کوچوان اور پھر ہم دونوں لسی پر ایسے ٹوٹے کہ مزید دو جگ پی گئے۔

لسی پینے کے بعد دونوں طرف خاموشی چھائی رہی، پھر نذیراں نے سکوت توڑا اور لال

دین کی طرف منہ کر کے بولی، لہجہ پہلے کی نسبت دھیما تھا۔

"دیکھ میاں لال دین، بگلوں کے پورے دو سو بچے میں اپنے گھر چھوڑ آئی ہوں اگرچہ گناہ سارے کا سارا تیرا ہی ہے، لیکن پھر بھی ہمارے گاؤں کی بات ہے۔ آخر میں بھی تو گاؤں کی ممبر ہوں۔ سو جو میرا فرض بنتا تھا، میں نے ادا کیا۔ تھوڑے سے بگلے تیرے پاس لے آئی ہوں تاکہ ہم ان کی پرورش کریں"۔ یہ کہہ کر اس نے ٹوکرے سے کپڑا کھول دیا۔ کپڑا کھلنے کے ساتھ ہی بگلے پھدک کر باہر نکلنے لگے، جنہیں ہم پھر بھاگ بھاگ کر پکڑ لائے، مگر آدھے کے قریب ٹوکرے کے اندر ہی دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔

لال دین نے تمام زندہ بگلے گھر بھجوا دیے اور بڑی مروت سے نذیراں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ نذیراں نے دو تین دفعہ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے اصرار کر کے بٹھا لیا اور کہا کہ روٹی کھا کے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد میں اور میرا چچازاد ندی میں کود پڑے اور پانی میں نہانے لگے، جو نیم کی چھاؤں اور خنک ہواؤں کی وجہ سے اور بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لال دین اور نذیراں نہ جانے اس عرصے میں کیا باتیں کرتے رہے کہ اُن دنوں سیاست، ممبری، عدالت جیسے الفاظ ہماری سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔ وہ باتیں کرتے رہے اور ہم نہاتے رہے۔ کوچوان بھینسوں کے آگے پڑی گھاس اُٹھا کر اپنے گھوڑے کو کھلاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح گزرا کہ چائے بن کر آ گئی۔ پھر ہم سب مزے سے چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران بھی نذیراں اور لال دین باتیں کرتے رہے مگر ہم نے دیکھا کہ اب نذیراں لال دین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی گویا کوئی مخالفت تھی ہی نہیں۔ چائے پینے کے بعد کچھ ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ اچانک لال دین نے نذیراں سے کہا!

"نذیراں، تو نے میرا گھر تو اندر سے دیکھا ہی نہیں، چل دیکھ تو سہی" میری بیوی نے کیا خوبصورت نقش و نگار بنائے ہیں، وہ بھی تمہیں ملنا چاہتی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نذیراں بھی۔

جب نذیراں اور لال دین دوبارہ واپس آئے تو ایک بج چکا تھا۔ میں نے سوچا کاش نذیراں لال دین کے گھر میں نہانے کی بجائے ہمارے ساتھ اسی ٹھنڈے پانی میں نہا لیتی تو اسے کتنا مزا آتا اور لال دین کی طرف دیکھو، گھر کے سامنے اتنے ٹھنڈے پانی کی ندی جاری ہے اور یہ احمق بگلے کے گرم پانی سے نہا کے نکلا ہے۔

اب ہم سوچ رہے تھے کہ جانے کب واپسی ہوگی بلکہ کوچوان نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو لال دین نے اسے پھر بٹھا دیا کہ روٹی کھا کے جانا۔ تھوڑی دیر میں ہی تیار ہو جائے گی۔ نذیراں تو اب اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دو ایک چارپائیاں اور بچھ گئیں، جس پر گاؤں کے پندرہ بیس لوگ مزید آ بیٹھے۔ اب بھلا نذیراں کی زبان کب رُکتی تھی۔ چھوکریوں کے کریکٹر سے ہوتی ہوئی سیاست اور وہاں سے روم و مصر کے موضوعات لپیٹ دیے۔ بیچ میں ایسے ایسے لطیفے چھوڑ ے کہ بعض مرد تو شرم سے لال ہو گئے۔

اب نذیراں کے ساتھ کوچوان اور ہمیں بھی لال دین کا گھر دیکھنے کا شرف ہوا جسے دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ اس سے تو اچھا ہمارا اپنا گھر تھا۔ نہ جانے نذیراں ایک گھنٹہ کیا دیکھتی رہی۔ پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اسے نہانے میں بھی تو وقت لگا ہوگا۔ برآمدے میں دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز پر کھانا لگا تھا۔ کھانے میں حلوہ، بھنا ہوا گوشت اور تندور کی روٹیاں تھیں۔ ہم چاروں صبح کے بھوکے تھے۔ سارا کچھ چٹ کر گئے۔ ہمارے کھانے کے دوران لال دین مسلسل حقہ پیتا رہا جبکہ نذیراں جزپ جزپ کھاتی گئی اور ہمیں کہتی جاتی، کھاؤ کھاؤ، آج ہی تو لال دین ہاتھ لگا ہے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ نذیراں سے پالا پڑا ہے۔ ہم نے برتن خالی کر دیے پھر حلوہ بھی کھا گئے۔

کھانے کے بعد دوبارہ چائے بن گئی جسے پینے میں ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مزا آیا۔ اس کے بعد نذیراں نے دو چار حقے کے مزید کش لئے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب چار بج چکے تھے اور ہم چلنے کے لئے بے چین تھے۔ باہر نکل کر تانگے پر بیٹھ گئے۔ چلنے سے پہلے لال دین نے پچاس روپے نکال کر کوچوان کو دیے کہ یہ کرایہ میری طرف سے رکھ لو۔ نذیراں کی آنکھوں میں ایک تشکر آمیز چمک پیدا ہوئی۔

تانگا چلنے لگا تو نذیراں نے لال دین کا شکریہ ادا کیا اور کہا لال دین، اب شاید خدا تمہارا گناہ معاف کر دے کہ تو نے ہماری بہت خدمت کی اگرچہ تیری بیوی کو گوشت پکانا نہیں آتا کہ اس کا ذائقہ کچھ اچھا نہیں تھا۔

لال دین گھر میں داخل ہوتے ہوئے رُکا اور شرارت آمیز لہجے میں بولا، نذیراں، بگلوں کے گوشت کا ذائقہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بٹیرے لے آتی تو وہ پکوا دیتا۔

یہ سن کر نذیراں، لال دین کو دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی، جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو جبکہ ہمیں نتے شروع ہو گئیں اور کوچوان نے جلدی سے تانگا بھگا دیا۔

maablib.org

نرینہ اولاد

بابا کانا نیم پیس، بابا کانا نیم پیس، کے آوازے کستے ہوئے ہم اُس سے دور بھاگ جاتے۔ وہ ہمارے پیچھے گالیاں دیتا ہوا کچھ فاصلے تک بھاگتا پھر پتھر اُٹھا کر پورے زور سے ہماری طرف پھینک دیتا، جو کافی پیچھے رہ جاتا۔ ہم اُس کی سخت مزاجی کو جانتے تھے لہٰذا ہمیشہ اُس پر اُس وقت آوازہ کستے جب اطمینان ہوتا کہ پکڑے نہ جا سکیں گے یا اُس کے پتھر کی زد سے دور رہیں گے۔

گاؤں کے بچوں کو اُس سے کچھ زیادہ ہی چڑ تھی۔ کوئی بچہ ہی ایسا ہوگا جو اُسے مذاق کر کے نہ بھاگتا ہو۔ گاؤں کا یہ واحد نائی تھا جس کی بچوں کے ساتھ کھلے بندوں دشمنی چلی آتی تھی۔ بچے جس میں مَیں خود بھی شامل تھا۔ نہ صرف اس پر آوازے کستے بلکہ شدید نفرت بھی کرتے۔

اُس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلتا اور ہر قدم کے ساتھ 60 درجے کے زاویے تک دائیں طرف کو جھک جاتا۔ پاؤں میں ٹائر کے بنے ہوئے جوتوں کے سوا میں نے کوئی جوتا نہیں دیکھا۔ شکل انتہائی کریہہ جسے دیکھنے والے کو گھِن آتی۔ جہاں سے گزرتا، بدبو اور تعفن پھیلاتا جاتا۔ شاید عید بقر عید نہاتا ہو لیکن اکثر یہی کہتے سُنا گیا کہ جو بندہ نہانے کے لیے سَو اکلو پانی سے زیادہ استعمال کرے گا، وہ خدا کا عذاب اٹھائے گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُس کی ایک لنگی اور ایک ہی کرتہ تھا۔ گرمیوں میں جب وہ اپنی چارپائی باہر کھلی فضا میں رکھ کر سوتا تو وہی لنگی کمر سے کھول کر اوپر لے لیتا تاکہ مچھروں سے بچا رہے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں نے اُسے اس بات پر ٹوکا بھی مگر وہ اپنی دُھن کا پکا تھا۔ غالباً نیا کپڑا لینے یا پُرانے کو اتار کر دھونے کے جھنجھٹ میں کبھی نہیں پڑا۔ کپڑے دھونا تو دور کی بات اُس نے اپنے چائے اور

ہانڈی روٹی کے برتن بھی شاید کبھی دھوئے ہوں جو اس واحد جھونپڑی میں کھلے پڑے رہتے تھے۔ جس کے آگے نہ کوئی صحن تھا، نہ صحن کی دیوار۔ صبح چائے بناتے ہوئے راہ چلتوں کو نہ کبھی اُس نے چائے کی دعوت دی اور نہ ہی کسی نے شریک ہونے کی خواہش کی۔ چائے پی کر اپنے اوزاروں کی پوٹلی کھولتا اور 9 بجے تک وہیں بیٹھا دیوار کے سائے میں لوگوں کی حجامت بناتا۔ جو اُس کے دروازے پر چل کر آتے۔ اگر کوئی چائے پینے کے دوران آجاتا تو ایسا فقیرانہ استغنا برتتا کہ آدمی رشک سے مر جائے۔ بال کترتے وقت زبان قینچی سے زیادہ چلاتا اس لیے کہ سالوں بعد اگر کبھی موج میں آتا تو قینچی کا منہ لگوا لیتا۔ اِس سے بُری حالت ٹنڈ کرنے والی مشین کی تھی جس سے بچے تو بچے بڑوں کے پسینے بھی چھوٹ جاتے۔ بال کاٹنے سے زیادہ کھینچتی تھی۔ اس کے باوجود ہمارا سارا محلّہ، جس میں قریب دو سو گھر ہوں گے، کٹواتے۔ ایک تو اُس کا معاوضہ بہت کم تھا اور دوسرا بال کاٹنے یا یوں کہیں ٹنڈیں کرنے عین وقت پر آجاتا۔ ہر گھر میں ٹنڈیں کرنے کی تاریخ اُسے ہمیشہ یاد رہتی۔ بعض گھرانوں کی ٹنڈیں تو بغیر معاوضہ کے ہی یعنی صرف روٹی اور چائے پر ہی کر دیتا۔ اُس کا زیادہ تر کام بارٹر سسٹم کے مطابق چلتا۔ بالوں کو بناتے ہوئے معتوب کا مشورہ سننا اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ فوراً دھکا دے کر پرے کر دیتا اور اپنی مشین گتھلی میں ڈال دیتا۔ لہٰذا ادھ خطے کو اپنے مشاورتی الفاظ اُسی وقت واپس لینا پڑتے۔

میرے ساتھ اُس کی دشمنی اُس وقت شروع ہوئی جب میں نے اُس سے ٹنڈ کروانے سے انکار کر دیا جو میرے باپ کو بہت بُرا لگا۔ اُس نے چھڑیوں سے مار مار کر کانے نیم چیں کے آگے کر دیا۔ اُس دن ظالم نے میرے بال مشین کے ساتھ اتنے اکھیڑے کہ سر کی جلد سوج گئی۔ میں کئی گھنٹے روتا رہا اور رات سوتے وقت کانے نیم چیں کے حق میں خلوصِ دل سے بددعائیں کیں۔ کہ یا اللہ صبح یہ زندہ نہ اُٹھے مگر وہ یونہی زندہ رہ کر میرے سینے پر مونگ دلتا رہا۔ مجھے ٹنڈ کرانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کانے سے ٹنڈ کرانے میں قباحت یہ تھی کہ لوگ پہچان جاتے کانے نیم چیں کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہی بات میرے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ اُس نے اپنا ایک طبی فلسفہ ہر والدین کو ازبر کرا دیا تھا کہ ٹنڈ کرائے رکھنے سے بچہ صحت مند رہتا ہے۔ خاص کر گردن موٹی ہوتی ہے۔

اس کی ایک خصوصیت میں تسلیم کرتا ہوں۔ وہ بغیر گھڑی کے بالکل صحیح وقت بتاتا۔ صرف سورج کو دو تین بار دیکھتا اور اپنا فیصلہ سنا دیتا کہ کتنے بجے ہیں۔ غالباً پانچ سات منٹ سے

زیادہ فرق نہ نکلا مگر یہی خصوصیت بچوں نے اُس کی چھیڑ بنادی۔ رفتہ رفتہ یہ چھیڑ اتنی زیادہ بن گئی کہ کوئی وقت بھی پوچھ لیتا تو یہ اینٹ اُٹھالیتا اور گالیاں دیتے دیتے گاؤں سے چلے جانے کی دھمکی بھی دے دیتا کہ میرے بعد تمہارے بال کوئی نہیں کاٹنے گا پھر سکھ بن جاؤ گے۔

میرے والد نے اکثر اُسے کریدنے کی کوشش کی، میاں شرفو (اصل نام شریف تھا) آخر تمہارے کہیں بیوی بچے بھی ہو نگے۔ کوئی اصلی وطن ہوگا۔ کچھ تو خبر کرو۔ کل کلاں خدانہ کرے ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی پھر ہم کس کا منہ دیکھیں گے۔

منہ کس کا دیکھنا ہے، اگر دفنا نہ سکو تو آگ لگا دینا، شرفو نے بگڑ کر جواب دیا۔ لہٰذا مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

مجھے انتہائی خوشی اس بات کی ہوتی کہ شادی غمی میں کاٹنے تیم میں سے کوئی بھی دیگیں نہ پکواتا۔ نہ کوئی برتن دھلواتا۔ پھر بھی ایسا کمینہ تھا، خود بخود چلا آتا اور نائیوں کو مشورے دینے شروع کر دیتا۔ نمک یہ ڈالو، مرچ فلاں ڈالو، گھی کم ڈالو وغیرہ مگر نائی بھی اپنی ہی کرتے۔ فقط اُس سے پیاز کٹوا لیتے۔

چونکہ شرفو کی جھونپڑی ہمارے گھر سے بیس قدم پر تھی۔ لہٰذا اکثر تاکرا ہوتا۔ مجھے نہیں پتا جب وہ بیمار ہوتا تو اُس کی دیکھ بھال کون کرتا تھا۔ ہم نے یا اُس کے پڑوس میں دو ایک گھر جو اور تھے، انہوں نے تو کبھی نہیں کی۔

کوئی بال کٹوانے جاتا اور وہ کہہ دیتا کہ میں بخار میں ہوں یا سر درد ہے تو اُس کا جواب سُن کر واپس لوٹ آتا، یہ سوچے بغیر کہ اب اِس کے دوا دارو کا ذمہ دار کون ہے۔ مجھے اِن چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے اور دوسرے کئی بچوں کی خوشی تو اِسی میں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ مر جائے تاکہ ہماری ٹنڈوں سے جان چھٹے۔

رفتہ رفتہ ہم بڑے ہو گئے۔ وہ بوڑھا ہوتا گیا۔ اب وہ ہماری مرضی کے بغیر ٹنڈیں نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اُسے نزدیک سے بھی آ کر چھیڑ سکتے تھے۔ آوازہ کسنے کے ساتھ ساتھ پیچھے سے آ کر دھکا بھی دے دیتے اور بھاگ جاتے کیونکہ اب ایک تو وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ پتھر اُٹھا کر ہمارے پیچھے پھینکنا بھی اب اُس کے لیے آسان نہیں تھا۔ بس گالیاں دیتا رہ جاتا جن سے ہم مزید لطف اندوز ہوتے۔

ہمارے گھر سے چالیس قدم مغرب کی طرف ہائی سکول تھا، جس میں شیشم، شہتوت اور نیم کے بے تحاشا درخت تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ گرمی سے بچنے کے لیے اپنی چارپائیاں دوپہر کو وہیں لے آتے کیونکہ تین ماہ سکول بند رہتا۔ کانے نیم پیس کا بھی سارا دن اب وہیں گزرتا۔ وہیں حجامتیں ہوتیں۔ کانے نیم پیس پر آوازے بھی وہیں کسے جاتے جس پر بہت ہنگامہ آرائی اور شغل رہتا۔ بعض اوقات گالیاں دیتے دیتے اُسے کھانسی کا دورہ بھی پڑتا جس میں اُسے کافی تکلیف ہوتی اور سانس ٹوٹنے لگ جاتا۔

سکول کھلتے ہی لوگ بکھر گئے۔ کانا نیم پیس اب بیمار رہنے لگا تھا۔ سر مونڈنا بھی کم کر دیے۔ لوگ مذاق کرنا بھی چھوڑ گئے کیونکہ اُس نے گالیاں دینا بند کر دیں تھیں۔ فقط غصے سے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیتا۔ یہاں تک کہ اب بچوں کے مذاق کو بھی سہہ جاتا لیکن بچے باز آنے والے کب تھے۔ جب دیکھتے کہ آوازہ کسنے اور دھکا دینے پر بھی چپ رہا تو دور سے کنکر اُٹھا کر مارنے شروع کر دیے۔ ادھر یہ کچھ دن تو گزارا کرتا رہا آخر تنگ آ کر اپنی جھونپڑی میں ہی بیٹھ رہا۔ بازار میں آنا جانا چھوڑ دیا۔

اب کوئی اکا دُکا اُس سے حجامت کروانے جاتا ورنہ اکثر لوگوں نے دوسرے نائیوں کی طرف رجوع کر لیا۔ سردیاں آئیں تو چارپائی پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔

صبح کے وقت میں اُدھر سے گزرتا۔ اب میں نے کبھی اُسے چائے بناتے اور پیتے نہیں دیکھا۔ شاید ناشتہ ترک کر دیا تھا البتہ حجامت کرنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ایک دن میں صبح اپنے سکول جا رہا تھا کہ کچھ لوگ کانے نیم پیس کی جھونپڑی کے گرد کھڑے نظر آئے۔ میں بھی پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا، یار دروازہ توڑ کر تو دیکھو۔ دوسرے نے تائید کی۔

دروازہ توڑا گیا تو توقع کے مطابق نیم پیس مردہ پڑا ہوا تھا۔ انتہائی گندی رضائی جو سینے تک اوڑھی ہوئی تھی اور منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ منہ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ چہرہ نہایت خوفناک ہو گیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ آج مجھے اُس کے مرنے کی ذرا برابر خوشی نہ ہوئی اور شاید غم بھی نہیں تھا۔ جھونپڑے میں ایک لوہے کا صندق، اوزاروں کی گٹھلی اور واحد چارپائی، جس پر اُس کی لاش پڑی تھی، کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔

دو مُسلی بلوائے گئے۔ جنہوں نے اُسے نہلایا۔ ایک آدمی نے کفن دے دیا اور شام سے پہلے ہی جنازہ کروا کر اُسے دفنا دیا۔ میں نے زندگی میں شاید یہ واحد جنازہ دیکھا جس میں کسی کو روتے یا آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ اتنی خاموشی سے دفن کر دیا گیا جیسے کوئی مرا ہی نہیں۔ چوتھے دن ایک ادھیڑ عمر شخص آیا جس نے اپنے آپ کو شرفو نیم حکیم کا بیٹا بتایا۔ لوگوں نے فوراً یقین کر لیا کیونکہ اُس کی شکل شرفو سے ملتی تھی۔ انہوں نے اُسے شرفو کی قبر بتائی۔

اگلے دن میں نیم حکیم کی جھونپڑی کے پاس سے گزرا تو وہی شخص وہاں کھڑا تھا جس کے ساتھ ایک گدھی ریڑھی تھی۔ وہ نیم حکیم کا بستر، چارپائی، اوزاروں کی تھیلی اور صندوق ریڑھی پر رکھ چکا تھا اور دروازہ اُکھیڑ رہا تھا تاکہ یہ سامان اپنے ساتھ لے جائے۔ آخر وہ نیم حکیم کا بیٹا تھا لہٰذا ترکے کا وارث اُس کے سوا کون ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی واحد نرینہ اولاد تھی۔

maablib.org

شہابو خلیفہ کا شک

سیالکوٹ سے پیرمست کی روانگی کی خبر کیا آئی، پورے علاقے میں میلے کا سماں بندھ گیا۔ پچھلے برس کا شکار لوگ کیسے بھول جاتے؟ نگاہوں میں پیرمست کے کتے اور اُن کی طراریاں پھرنے لگیں۔ گھر آنگنوں اور چوراہوں میں کتوں کے تذکرے چھڑ گئے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، پیرمست کے کتے زیرِ بحث آئے۔ عصر کے بعد تو لڑکے بالوں سے لے کر بڑے بوڑھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ اسی ذکر سے روشن ہو جاتیں۔

ایک بولا، میاں کتے کیا ہیں، چیتے ہیں چیتے۔ یوں ایک قدم اُٹھا اور پندرہ گز سمیٹ لیے۔ دوسرے نے کہا، لو اور سنو، بھائی! وہ تو چلتی پھرتی موتیں ہیں۔ چیتا بیچارا کیا جانے کہ شکار کیسے کرتے ہیں؟ پچھلے سال تُو نے دیکھا نہیں؟ پیرمست کے ''کالے'' نے ٹیلے سے اُترتے ہی خرگوش پر کیسی جھپٹ ماری۔

ہاں! واہ بھئی، مزا آ گیا تھا۔ ایسی اونچی چھلانگ؟ میاں خدا جھوٹ نہ کہوائے۔ ''کالا'' پانچ منٹ تک تو ہوا میں ہی رہا۔ پھر جو ایک پنجہ دیا، خرگوش بیچارا بیں بھو بالیاں کھا گیا۔ اور ابھی حواس مختل ہی تھے کہ آنتیں ''چھیتل'' کے منہ میں تھیں۔ بس جی! جہاں ''چھیتل'' اور ''کالا'' پہنچ گئے، پھر وہاں، ملک الموت کی عزت تو خاک میں گئی۔'' دلاور بول اُٹھا، بیچارا ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے کہ شکار کی جان اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی کتے نکال لیتے ہیں۔

غرض جدھر سے گزرتے، پیرمست اور اُس کے دونوں کتوں ''کالے'' اور ''چھیتل'' کی گفتگو ہو رہی ہوتی۔ ایک دفعہ تو اسی گفتگو میں بحث اور پھر سر پھٹول تک بات جا پہنچی۔ ہوا یہ کہ خیر محمد بھنگ پیے ہوئے تھا اور اسی ترنگ میں اُس نے کہیں شاہ دین کے ''فائٹر'' کی تعریف

کردی۔ اب بھلا یہ کوئی موقع تھا "فائٹر" کا نام لینے کا؟ کہاں پیر مست کا "چیتل" اور کہاں شاہ دین لنگڑے کا "فائٹر"؟ گویا شیر بکری کو ملا دیا۔ نور خاں کے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھے تمام لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ حیات خاں کا تو خون ہی کھولنے لگ گیا۔

او! شاہ دین کے چوزے، تو نے سمجھا کیا ہے "فائٹر" کو؟ وہی! جو مرغی کو دیکھ کر بھاگ اُٹھتا ہے۔

اس سے تو نظام دین کی بکری دلیر ہے۔ شامو فوجی ایک طرف سے بولا جو فوج سے بھگوڑا ہوا تھا۔

واہ بھئی واہ شامو! شاہ دین کے فائٹر کو بکری سے مقابل کرنا آپ ہی کے لائق ہے۔ جلال احمد کہنے لگا، یوں کہو، جیسا گیدڑ شاہ دین ویسا اُس کا فائٹر۔

بس اسی پر شاہ دین کے بھانجے کو طیش آ گیا۔ اُس نے وہیں اُلٹے ہاتھ سے جلال کے سر پر گنگا جما دیا۔ پھر کیا تھا؟ کیا جوتے اور کیا لکڑیاں، جو جس کے ہاتھ میں آیا کھینچ مارا اور پانچ ہی منٹ میں ہر بندہ رنگو رنگی۔ پھر آپ ہی آپ لڑائی بند کر دی کہ یہ ایک فضول کام تھا۔

یہ سب تو ایک طرف لیکن سچ پوچھیں تو میں کہوں گا پیر مست کے کتوں کا واقعی جواب نہیں تھا۔ اس لئے کہ پچھلا شکار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ساڑھے تین تین فٹ اونچے چمکتے ہوئے بُولی نسل کے سیاہ کتے تھے۔ پاؤں میں چاندی کی جھانجھریں اور چاندی ہی کے زنجیر گلے میں تھے۔ شکار کے پیچھے دوڑتے تو چھن چھن کی آواز آسمانوں کو چڑھتی سنائی دیتی۔ گوشت اور شکار سے اتنے طاقتور ہو گئے کہ ایک کتے کے زنجیر کو دو آدمی پکڑتے پھر بھی گھسٹتے چلے جاتے۔ شکار کے وقت چھلانگ تو ایسی قیامت کی لیتے کہ نظر چکرا جاتی۔ گویا بجلی کی کوندا آنکھوں کے آگے سے نکل گئی ہو۔ جب سے میں نے شکار دیکھا آئندہ کا انتظار رہا اور اب وہ موقع دوبارہ آ رہا تھا۔

معاملہ دراصل یہ تھا کہ پیر مست، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کے دادا نے مٹی کی دیوار پر بیٹھ کر حکم دیا کہ "چل" تو دیوار چل پڑی تھی، سیالکوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے جہاں اُن کی بڑی زمینیں تھیں اور پورے پنجاب میں ہزاروں مرید تھے۔

حضرت صاحب نے دو کتے پال رکھے تھے۔ وہ ہاڑ کے فوراً بعد اپنے قصبے سے پیدل

چل نکلتے، جس کا ایک مقصد تو شکار کرنا اور دوسرا اپنے مریدوں کے ہاں پھیرا لگانا ہوتا۔ قصبے سے نکلنے سے پہلے ایک آدمی رستے میں پڑنے والے تمام گاؤں کو اطلاع کر دیتا۔ پیر صاحب اپنے قصبے سے دو خلیفوں اور دونوں کتوں چیتل اور کالے کے ساتھ نکلتے، شکار کرتے پیدل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جا پہنچتے۔ رات وہیں بسر کرتے، اگلے دن وہاں سے چار پانچ مرید مزید ساتھ ہو لیتے۔ جیسے گاؤں در گاؤں فاصلہ طے ہوتا، قافلہ بڑھتا جاتا اور شکار میں رونق پیدا ہوتی جاتی۔ رات جس گاؤں میں قیام ہوتا وہاں پیر مست اور اُس کے کتوں کی اس طرح خدمتیں ہوتیں کہ لوگوں کو رشک آ جاتا۔ خوب مالشیں کی جاتیں۔ گرم پانی اور سرف صابن سے نہلایا جاتا۔ رات کو پیر مست اُنھیں اپنے ساتھ سلاتا۔ ایک کو دائیں اور دوسرے کو بائیں طرف۔ اسی طرح پچھلے گاؤں سے قافلے میں داخل ہونے والے مریدوں کی بھی کافی آؤ بھگت ہوتی۔ چونکہ ہر گاؤں میں پیر مست کے کئی مرید تھے جن میں بہت سے شکار کے شوقین بھی تھے۔ ہمارے گاؤں پہنچنے تک قافلہ سینکڑوں مریدوں پر مشتمل ہوتا۔ اب جوں جوں ہمارے گاؤں میں پیر مست کے داخل ہونے کے دن قریب آ رہے تھے جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔

پیر مست ہمارے گاؤں میں دو دن قیام کرتا اور گاؤں کے جنوبی ٹیلوں کو شکار کے لئے منتخب کیا جاتا جہاں کبھی دریائے بیاس پوری جولانی سے بہتا تھا۔ اب وہاں دور تک عک کے پودے، خاردار جھاڑیاں اور ببول کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ کئی اونچے نیچے ریت کے ٹیلے تھے۔ اُنھیں ٹیلوں اور جھاڑیوں میں خرگوش، سوّر، سیہہ اور اسی طرح کی ہزاروں بلیات پڑی پھرتی تھیں۔ بعض لوگوں کو سنا ہے، وہاں اژدھے بھی نظر آئے۔ غرض شکار کے لئے یہ علاقہ ایک جنت کی حیثیت رکھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ چیتل اور کالے کے جوہر بھی زیادہ یہیں کھلتے۔

خدا خدا کر کے ایک شام پیر مست گاؤں میں وارد ہو گئے۔ دو سو آدمی ڈھول بجانے والے کے ساتھ استقبال کی خاطر باہر نکل آئے۔ آگے آگے پیر مست اور اُس کے کتے تھے جن کے پٹوں میں سونے کے کیل جڑے تھے اور چاندی کی لمبی لمبی زنجیریں خلیفوں نے پکڑی ہوئی تھیں۔ پیچھے سو آدمی اور تھے۔ کچھ آدمی ہمارے گاؤں کے بھی ساتھ تھے، جو ایک دن پہلے ہی آگے سے جا کر مل گئے تھے۔

جونہی پیر صاحب نزدیک آئے، لوگوں نے بھاگ کر پہلے پیر مست کے پاؤں

کو بوسے دیے، پھر کتوں کے منہ سر چومنے لگے۔ اس دھکم پیل میں ہجوم اس قدر بڑھا کہ پیر مست کتوں سمیت بوندلا گئے۔ دوسری طرف ڈھول کی تھاپ اور پٹاخوں کے شور نے سماعت چھین لی۔ بعض گلاب اور چنبیلی کے ہار پیر مست اور کتوں کے گلے میں ڈالنے لگے۔ پھولوں کی پتیاں بکھرنے لگیں۔ جو ہار بچ گئے انہیں خلیفوں کے گلے میں ڈال دیا۔ غرض بڑی دھوم دھام سے پیر مست کو حیات خاں کے چبوترے پر لایا گیا۔ جہاں دُور تک چبوترے اور بازار میں چارپائیاں پہلے ہی بچھا دی گئیں تھیں۔ پیر مست اور اُس کے کتوں کی چارپائیاں سامنے ہی تخت کی طرح تھیں جن میں سے ایک پر پیر مست اور دوسری پر چھیل اور کالا براجمان ہو گئے باقی مجمع سامنے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد تمام لوگوں کی شربت سے تواضع کی گئی لیکن خاص پیر مست کے لئے صندل تیار کر کے پیش کیا اور کتوں کے سامنے صندل ملا دودھ کا بڑا کونڈا رکھ دیا گیا۔ اُس کے بعد گاؤں والوں کا تانتا بندھ گیا، جو آتا، پیر مست کے قدموں میں سر رکھ دیتا۔ پیر مست دو تین بار اُسے تھپکی دیتے پھر کتوں کے منہ اور ہاتھ پاؤں مَس کرتا۔

بعض تو کتوں کو چومتے بھی۔ اس کے بعد بڑے ادب سے پچھلی چارپائیوں پر بیٹھ جاتے۔

رات دس بجے تک لوگ یونہی آتے جاتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں پھر اچانک پیر مست نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر جلالی انداز سے وعظ شروع کر دیا۔ مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بس اللہ سے نزدیکی یہی ہے کہ اُس کی مخلوق سے محبت کرو۔ کسی کو تکلیف دینا بڑا عیب ہے۔ چاہے وہ کتا ہی کیوں نہ ہو۔ محبت تم پر فرض ہے۔ یہی تمہاری نماز ہے اور یہی زکوٰۃ علاوہ اس کے روزہ نہ صلواۃ۔

بتاؤ مجھے! کہف کے کتے نے کتنی نمازیں پڑھیں؟ بولو! بلعم باعور کے گدھے نے کتنے روزے رکھے؟ (ہلکے سے توقف کے بعد) گئے دونوں جنت میں، کتا بھی اور گدھا بھی۔

خلیفہ جو دائیں طرف کھڑا تھا، اونچی آواز میں پکارا، حق ہے سرکار، حق ہے سرکار۔

(کچھ دیر خاموشی کے بعد) جو محبت کرے گا جس سے، جائے گا وہ ساتھ اُس کے، چاہے، بندہ کرے محبت ساتھ بندے کے، چاہے کرے محبت کتا ساتھ بندے

گے۔

حق ہے سرکار، حق ہے سرکار (خلیفہ مکرر بولتا ہے)"۔

رات گیارہ بجے تک یونہی وعظ رہا۔ پیر مست کی رعب دار آواز نے پوری محفل کو اپنے سحر میں لیے رکھا۔

اگلے دن جنوبی ٹیلوں کی طرف روانگی ہوئی۔ دس ڈنڈا بردار آگے ہوئے۔ وہ جھاڑیوں پر ڈنڈے مارتے اور عجیب وغریب آوازیں نکالتے، سیٹیاں بجاتے۔ جیسے ہی کوئی خرگوش یا سیہہ نکل کر بھاگتا۔ کتوں کا کام شروع ہو جاتا۔ پیر مست "حق مدد ہُو" کہہ کر کتوں کے زنجیر کھولنے کا اشارہ کرتا۔ پھر تو ایسا جوش وخروش بڑھتا کہ آنکھوں نے دیکھا ہو تو یقین آئے۔ ایسے ہی جھاڑیوں سے ایک گیدڑ نکل آیا جو سیدھا جیبل کی اور بھاگا مگر دم کی دم میں چیتل نے آگے سے جا گھیرا۔ بچارا اُلٹے قدموں ہُوا تو کالا آڑے آیا۔ پھر تو کم بخت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا پیر مست کے کندھوں کے اوپر سے چھلانگ مارتا ہوا مشرق کو پھرا۔ اس اچانک حملے سے پیر صاحب ٹیلے سے لُڑھکے اور کئی قلا بازیاں کھا گئے مگر ریت کی وجہ سے خاص چوٹ نہ آئی لہٰذا کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُدھر تماشائیوں کی ہلا بازی اور ہاؤ ہو نے مزید ہنگامہ کر دیا۔ اِدھر کالے اور چیتل ہوا میں اُڑتے ہوئے آگے سے ہو لئے۔ اس افراتفری میں گیدڑ بچارا ایسا بدحواس ہوا کہ زمین تنگ ہو گئی۔ کبھی اس جھاڑی میں منہ چھپاتا، کبھی اُس جھاڑی میں لیکن آئی کو کون ٹال سکے۔ جب چاروں طرف سے کتوں نے سمیٹ لیا تو بچارے نے بے بسی سے ایک گھورے میں اپنا منہ ٹھونس دیا۔

جیسے ہی چیتل کے دانت پیٹ میں گھسے، ایک قیامت کی چیخ ایسی بلند ہوئی کہ صحرا تھرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے کالے نے ٹانگوں کو جبڑے میں لے کر باہر گھسیٹ لیا۔ لہٰذا دو ہی منٹ میں پیٹ کھال سے باہر نکل آیا۔ ساتھ ہی 'حق ہو مدد غوث' کا غلغلہ بلند ہوا۔ اُس کے بعد کچھ دیر کتے گیدڑ کی لاش سے شغل کرتے رہے۔ بالآخر ایک فاتحانہ چال سے پیر مست کی طرف مُڑ آئے۔ پیر مست نے باری باری دونوں کو تھپکی دی اور عجیب سرشاری سے مسکرایا۔

غرض سہ پہر چار بجے تک ایک گیدڑ، دو سوّر، تین خرگوش اور ایک سیہہ کا شکار کیا۔ پھر سارا مجمعہ کچھ دیر آرام کے لئے ببول اور جھاڑیوں کے سایوں میں بیٹھ گیا۔ جب کہ دو خلیفے چیتل

اور کالے کی مالش کرنے لگے اگرچہ پیرمست پہلے ہمارے گاؤں میں کئی دفعہ آیا۔ لیکن میں نے یہ شکار دوسری دفعہ دیکھا اور ایسا دیکھا کہ آنکھوں میں نظارے بندھ گئے۔ رات دربار جما تو مزے کی گفتگوئیں سنیں۔

پیر جی دیکھا؟ چیتل نے تیسرے ٹیلے سے کیسی چھلانگ دی۔ ایک خلیفہ بولا، حضور میں نے تو سمجھا کہ میرے سر سے ہوائی جہاز اڑ گیا۔ ایک دم شاں کی آواز آئی۔

دوسرا خلیفہ بولا، میری تو جان ہی ہوا ہو چلی تھی۔ دھم سے اوندھا جا گرا۔

حضرت گیدڑ کو آپ سے گستاخی مہنگی پڑی، شامو کہنے لگا، میں دیکھ رہا تھا۔ جب آپ لڑھکے تو کالے کے تلوؤں میں جا گئی۔ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ اب تو گیدڑ کا مثلہ ہو کے رہے گا۔ شامو کے اس جملے سے پیرمست تھوڑا سا کھسیانا ہوا۔ اُسی لمحے حیات خاں نے شاموں کو گھور کے دیکھا۔

بس پھر بابا جی آپ نے بھی ایسی قلابازیاں لگائیں کہ ہم تو دنگ ہی رہ گئے۔ شاموں نے فوراً ہی لہجہ بدلا۔ پہلی بار آپ کی تیزیاں دیکھیں۔

ہاں شامو اگر میں اُسی وقت تیزی نہ دکھاتا تو حرامی کے پنجے آنکھوں میں گھس جاتے۔ پیرمست نے وضاحت کی۔

شیرو چوڑی والا جو ہر واقعے کو منظوم کر دیتا تھا۔ اُس نے گانا شروع کیا۔

دیکھی اج میں نے سگاں دی کمالاں
کالے دی دوڑاں چیتل دی چھالاں

جنگاں میں دیکھے ناں ایسے بہادر
موتاں، قضاواں کے لنگ جاویں باڈر

سوراں تے گیدڑ، سہواں تے گوشاں
رہیاں ناں چیتل کو ویکھ کے ہوشاں

چوڑی والا کی زوردار آواز نے ایسا سماں باندھا کہ جنگ کا نقشہ کھینچ دیا۔

جب رات کافی گزر گئی اور تھکے ہاروں کو اونگھ آنے لگی تو پیر مست نے اگلے دن کا پروگرام طے کر کے دربار برخواست کر دیا۔

اگلے دن گیارہ بجے تک تمام ٹیلے چھان مارے۔ ایک ایک جھاڑی کرید ڈالی مگر چوہا تک نہ ملا۔ خدا جانے کہاں گم ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا۔ اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ ایک بجے کے بعد تو پیر مست نے حوصلہ چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ واپسی کرو کیونکہ شکار صحرا کو چھوڑ کر کہیں کھیتوں میں جا چھپا ہے۔ ابھی یہ کہہ کر مڑے ہی تھے کہ پاس کی بڑی جھاڑی سے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک دم سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ سبحان خلیفے نے ایک زور کا ڈنڈا جھاڑی پر مارا تو موٹا تازہ خرگوش فرانے سے نکلا اور ہوا میں تیر گیا۔ فوراً چیتل اور کالے کے زنجیر کھول دیے۔ ہاہو، شور شرابہ شروع ہوا، گویا صحرا جاگ اُٹھا۔

لیکن دو تین ہی منٹ میں پیر مست سمیت تمام لوگ حیران رہ گئے۔ چیتل اور کالا برابر کوشش کرتے رہے مگر خرگوش ہے کہ گھیرے میں ہی نہیں آتا۔ بیس بیس فٹ کے جمپ مارتا ہے۔ ابھی اس ٹیلے پر، تو دوسرے ہی لمحے اگلے ٹیلے پر۔ دس منٹ بعد تو ایسے لگا کہ خرگوش، چیتل اور کالے کے ساتھ مذاق پر اُتر آیا ہے۔ دو دفعہ تو پورے مجمعے کے اوپر سے ہوا کی طرح نکل گیا۔ جب بیس منٹ گزر گئے اور خرگوش نے چیتل اور کالے کو چکرا کے رکھ دیا تو صلاح ٹھہری کہ لوگ تین طرف سے بکھر جائیں۔ ایک سمت خالی رکھی جائے تاکہ خرگوش سیدھا بھاگے اور کتوں کو بجی کبھی نہ دکھائے۔ خرگوش چند لمحے کسی نہ کسی جھاڑی میں رک کر سانس لیتا۔ جب کتے پہنچتے تو پینترا بدل کے اُلٹے ہاتھ نکل جاتا مگر پیر مست کی اس ترکیب نے خرگوش کو چونکا دیا۔ اب وہ پوری طاقت سے سیدھا بھاگنے لگا لیکن کتے بھی اپنی آئی پر آئے ہوئے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ فاصلہ کم ہونے لگا پھر ایک دم کالے نے قیامت کا جمپ لیا مگر قسمت کا کیا کیجیے کہ "ہونی" آئی تھی۔ خرگوش اسی لمحے رک کر زمین کے برابر ہو گیا۔ کالے نے اتنی تیزی سے قلابازی کھائی جیسے بجلی کا جھپاکا لگا ہو اور سامنے کھڑے ببول کی ایک موٹی سوکھی شاخ سے ٹکرا گیا۔ شاخ کی ایک نوک سیخ کی طرح نکلی تھی۔ وہ کالے کے پیٹ میں اندر تک گھس گئی۔ کالا تو وہیں لٹک گیا۔ اُدھر خرگوش جھیل کی طرف بھاگ نکلا۔ چیتل جو خود بھی قلابازیاں کھا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے سنبھلا

اور پیچھے ہوا۔

پیر مست اور دوسرے کئی لوگ دوڑ کر کالے کے پاس پہنچے مگر راستے میں وہ پورا ہو چکا تھا۔ بس ہلکے ہلکے سانس باقی تھے۔ پیر مست نے یہ دیکھا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ وہیں غش کھا کر گر پڑا۔ مریدوں نے ہاتھ پاؤں مسلنے شروع کیے۔ کوئی پانی لینے دوڑا۔ ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بڑا مجمع پیر مست کے گرد لگ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں؟ پیر کو سنبھالیں یا کتے کو دیکھیں۔ ادھر تو یہ صورت تھی، اُدھر ہوا یہ کہ خرگوش مغربی سمت میں کیچڑ سے اُچھلتا ہوا جھیل میں اور وہاں سے تیر کر آگے نکل گیا۔ چیتل پیچھے پیچھے تھا۔ اُس نے جیسے ہی تین چار جمپ مارے، سیدھا کیچڑ اور دلدل میں پھنس گیا۔ اب نہ واپس آیا جائے نہ آگے جایا جائے۔ ناچار اونچی آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ ادھر سے کچھ لوگ دوڑے۔ پگڑیوں سے پگڑیاں باندھیں۔ جب پگڑیوں کا لمبا رسا بن گیا تو مٹی کا ڈھیلا ساتھ باندھ کر چیتل کی طرف پھینکا لیکن ڈھیلا کپڑے سمیت دور جا گرا۔ چیتل لحہ بہ لحہ نیچے دھنس رہا تھا۔ آخر تیسری کوشش پر کپڑا اُس کے منہ کے قریب جا گرا۔ چیتل نے فوراً کپڑے کو جبڑے میں جکڑ لیا۔ چار آدمیوں نے زور لگایا۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ دلدل سے باہر کھینچا۔ باہر نکلتے ہی کتا نڈھال ہو کر گر پڑا۔

اب گاؤں میں ہر طرف سوگ کی حالت تھی۔ پیر مست رہ رہ کر کالے کو پکار رہا تھا۔ تمام مریدوں کو سانپ سونگھ گیا۔ کالے کی لاش حیات خاں کے چبوترے کے ایک طرف دفن کر کے پھول چڑھا دیے گئے۔ چیتل قبر کے پاس بیٹھا عجیب دردناک آوازیں نکالتا رہا، سینے چاک ہوئے جاتے تھے۔ تین چار دن تو سب پر خموشی چھائی رہی۔ آخر پانچویں دن سکوت ٹوٹا۔ جب پیر مست نے ٹھنڈا ہوکا بھر کر کہا۔

''اچھا! کالے جدائی مقدر میں تھی۔ تو نے جانے میں بڑی جلدی کی۔ اب زندگی بے لطف ہو گئی''۔ اتنا کہہ کر چیتل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ جب پیار بھرا ہاتھ چیتل کے جسم سے لگا وہ بے چین ہو کر پیر مست کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ پیر مست اور چیتل کے اس پیار سے لوگوں کے آنسو نکل آئے، آخر حوصلے بڑھے تو باتیں دوبارہ شروع ہوئیں۔

بابا جی میں نے تو اُسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ یہ خرگوش نہیں، اجل ہے اجل، شامو

فوجی نے کہا۔ بس دن پورے ہو چکے تھے۔

حضور جوڑی کیا ٹوٹی آسمان ٹوٹا۔ ایسا صدمہ یا تو اُجاڑے کے وقت پہنچا یا اب پہنچا، کالے کی جدائی کا۔ صدا حسین نے ٹھنڈی آہ کھینچی۔

لطیف بھائی مجھے تو ایک ہی دکھ ہے کہ اس سارے نقصان کے باوجود خرگوش سالم نکل گیا، خلیفہ بولا۔

سالم نہیں نکلے گا۔ پیرمست ایک دم گرجا۔ چاہے وہ کوئی چڑیل اور بھوت ہی کیوں نہ تھا۔ چھیتل اُسے پھاڑ کے دم لے گا۔

پیرمست کی آواز میں اتنی کڑک اور لہجہ ایسا دوٹوک تھا کہ مریدین کا پورا حلقہ ایک ہی بار سہم گیا اور مکمل خموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد پیرمست پھر بلند آواز میں کہنے لگا، کالا میرا اکھڑا تھا۔ جب تک حرامی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ہوتے نہ دیکھوں گا واپس نہیں جاؤں گا۔ یہاں تک کہ میری قبر بھی کالے کے ساتھ بن جائے۔ تخم پلید میرے کالے کو کھا گیا۔ چھیتل کو اکیلا کر دیا۔ حیات خاں! فوراً بندے بھیج کر ٹیلوں کی ناکہ بندی کرو اور جھیل کے مغرب میں اپنے کتے پھیلا دو۔ حق غوث نے چاہا تو کل یا ہم نہیں یا خرگوش نہیں۔ اتنا کہہ کر پیرمست نے چھیتل کو تھپکی دی۔ چھیتل! کالے کا بدلہ لیے بغیر نہیں ٹلنا۔ یہ ہمارا اُس سے عہد ہے۔ پیرمست کی آواز میں تحکم برقرار تھا۔

چھیتل پیرمست کی تائید میں دُم ہلانے لگا۔

پیرمست کے اس حتمی فیصلے اور جلالت پر شہاب خلیفہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر پیرمست سے کہا، ویسے تو سرکار آپ کی مرضی، لیکن میں تو کہتا ہوں واپس چلتے ہیں، آثار اچھے نہیں لگتے۔ لگتا ہے ستارے گردش میں ہیں۔ سینکڑوں شکار کھیلے، ایسی ہونی کبھی نہ ہوئی۔

پیرمست نے کڑک کر کہا، کیا بکتا ہے، تیرے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ خدا کے بندے عہد سے نہیں پھرتے۔ جب تک بدلہ نہ لوں گا، نیند حرام ہے۔

حضور سب ٹھیک، ''شہاب دوبارہ جرأت کر کے بولا'' لیکن میں نے رات بُرے بُرے خواب دیکھے کہ میں قبروں کا مجاور ہوں۔

شہابو! اپنی زبان بند رکھ۔ جب تک میں خرگوش کو پھاڑ نہیں دیتا، یہاں سے نہیں

نکلا۔ پیر مست ایک دم گرجا۔

یہ سنتے ہی شہاب خلیفہ سہم کر چپ ہو گیا۔

آج چار سو کے لگ بھگ آدمی اور چیتل کے علاوہ بیس کتے مزید تھے۔ جھیل سمیت تمام نیلوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلاش شروع ہو گئی۔ سہ پہر تک تین سوئر، چار گوہ، کئی ایک چھوٹے موٹے خرگوش شکار ہوئے لیکن مطلوبہ خرگوش کا اتہ پتہ نہ ملا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن بھی اس کی کچھ خبر نہ گی۔ خدا جانے اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ آہستہ آہستہ اکثر لوگوں کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا کئی مرید اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کیونکہ پیر مست نے اپنا اگلا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ اس لئے کہ آج اُسے یہیں پر آٹھواں دن تھا۔ اور مزید کئی دن تک تلاش جاری رکھنے کا عہد کیے ہوئے تھا۔ نویں دن شام کا دھندلکا ہو چکا تھا اور جھیل کے پار باجرے کے کھیت میں تلاش جاری تھی کہ اچانک ایک بڑا خرگوش پھر ظاہر ہوا۔ اب خدا جانے یہ وہی خرگوش تھا یا کوئی اور مگر سب نے یک زبان ہو کر "المدد غوث حق ہُو" کا نعرہ مارا۔ چیتل کا زنجیر کھل گیا، مرا ہوا جذبہ ایک دم بیدار ہو گیا۔ پیر مست ہر لمحے پہلے سے بلند نعرہ مارتا۔ خرگوش نے جب اپنی جان پر بنتے دیکھی تو ایسی طاقت سے دوڑا، کہ بھوت نے بھی ایسی تیزیاں نہ دیکھی ہوں گی۔ اُچھلتا ہوا بڑا وا تھا کہ پل میں یہاں تو پل میں اُفق کنارے۔ ان کرتبوں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ یہ خرگوش وہی ہے جس نے پیر مست کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دوسری طرف چیتل کی پھرتیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ خرگوش مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور چیتل جگر توڑ دینے والے حوصلے سے اُس پر چڑھتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنے دشمن کو پھاڑ کر دم لے گا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا ٹیلا سنستا چلا گیا، جھیل کا چکر کاٹ کر سبز کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ ہر گزرتے لمحے میں فاصلہ کم ہوتا گیا اور قریب تھا کہ چیتل خرگوش کو دبوچ لے لیکن اچانک ہی ایک مایوس کن صورت اُس وقت پیدا ہوئی جب خرگوش گنے کے لمبے چوڑے کھیت میں گھس گیا مگر چیتل نے بھی ہار نہ مانی، پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔ مریدین نے کھیت کو فوراً گھیرے میں لے لیا۔ جو اب تعداد میں پندرہ سولہ ہی رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک کھیت کے اندر کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں مگر اُس کے بعد خموشی چھا گئی۔ پیر مست سمیت سب لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے، پندرہ ہوئے، دھندلکا

اندھیرے میں بدلنے لگا، مگر اندر سے کوئی ہلچل ہوتی نظر نہ آئی۔ پیرمست کا اضطراب بڑھ گیا وہ بے چینی سے تڑپنے لگا اور اپنے چیتل کے لئے بہت فکر مند ہوا۔ پانچ چھ مرید زبردستی کھیت میں داخل کیے لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ نامراد باہر نکل آئے کیونکہ ایک تو اندھیرا تھا اور دوسری بات یہ کہ چیتل کی گمشدگی نے ایک خوف پیدا کر دیا۔ آخر گاؤں میں آدمی دوڑایا گیا۔ سینکڑوں لوگ پھر اکٹھے ہو گئے، مگر کوئی بھی گنے کے کھیت میں گھسنے کو تیار نہ تھا۔ سب پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ اُدھر چیتل ہے کہ اُس کی خبر ملنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جوں جوں رات گزرتی گئی پیرمست کی حالت غیر ہوتی گئی۔

دن چڑھا تو کئی لوگ ہمت کر کے کھیت میں داخل ہوئے۔ دوپہر تک تمام کھیت چھان مارا لیکن چیتل کی کوئی خبر نہ ملی۔ یوں دوسرا دن بھی ناکام گیا۔ تیسرے دن کھیت کاٹنے کا فیصلہ ہوا، سب نے ٹوکے اور درانتیاں لے کر کھیت پر ہلہ بول دیا۔ ابھی آدھا کھیت کاٹا تھا کہ زمین میں ایک بڑا سوراخ نظر آیا۔ تھوڑا سا جھک کر دیکھا تو ایک دیو قامت اژدھا دور تک لیٹا ہوا پھنکار رہا تھا۔ سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اس لئے کہ ایسی بلا تو قصہ کہانیوں میں ہی سنتے آئے تھے، دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اژدھا نے غالباً پہلے دن کے شکار میں ہی ٹیلے چھوڑ دیے تھے۔ اُس نے خطرے کی دھمک محسوس کر کے گنے کے کھیت میں پناہ لے رکھی تھی۔ حیات خان نے فوراً اُس پر دونالی سے ایل جی کے دو کارتوس داغ دیے۔ جنہوں نے لمحے میں اژدھے کا کام تمام کر دیا۔ پھر ٹوچن لگا کر اُسے باہر کھینچ لیا۔ پیرمست نے آگے بڑھ کر دیکھا تو چکرا کر گر پڑا۔ دراصل اژدھے نے چیتل کو نگل لیا تھا۔

پیرمست کے گرتے ہی مریدوں میں چیخ چنگاڑا شروع ہو گیا۔ کچھ تو پیر کی محبت میں زمین پر لوٹنیاں لینے لگے اور اپنے سر میں خاک ڈالنا شروع کر دی۔ دو چار نے حواس بحال رکھتے ہوئے پیرمست کو جلدی سے گاؤں کے ہسپتال میں پہنچایا لیکن سب بے کار تھا، ڈاکٹر نے کہا، باباجی کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے۔

اگلے دن صبح تک یہ بحث جاری رہی کہ آیا چیتل کی کوئی نشانی، پنجہ، کان یا کوئی ناخن وغیرہ ہے، جسے پیرمست اور کالے کے ساتھ دفن کر دیا جائے لیکن کوشش کے باوجود چیتل کی کوئی چیز نہ ملی۔ بالآخر شامو نے کہا، کیوں نہ اژدھے کی قبر بھی پیرمست اور کالے کے ساتھ بنا دی

جائے۔ آخر کو چیتل اژدھے کے اندر ہی تو ہے۔

اب خلیفہ شہاب دین صبح اُٹھ کر روزانہ تینوں قبروں پر جھاڑو دیتا ہے مگر اُس کے دل سے ایک کسک نہیں جاتی کہ آیا تیسری قبر اژدھے کی ہے یا چیتل کی؟

maablib.org

شاہ مدار کی پازیبیں

شاباش موتگیا شاباش، مار ایک چونچ اور، پھڑ کا دے اسی جگہ دُم کیلئے کو، واہ رے واہ واہ، ہت ترے کی، مار ایک اور۔ ہا آ، واہ بھئی واہ۔

جوں جوں مرغوں کی لڑائی میں تیزی آتی گئی بابے چراغ دین کی آواز بلند ہونے لگی۔ سینکڑوں آدمی ہوں گے کہ ارد گرد جمگھٹا تھا۔ ہر چونچ کی ضرب پر داد کے ڈونگرے برستے، ارے واہ، شاباش، کاٹ دے کلغی، پھاڑ دے پوٹا کی آوازیں کان بہرے کیے دے رہی تھیں۔

ادھر شریفے لٹھ باز نے جب مُرغ کو پٹتے دیکھا تو تماشائیوں کے ساتھ اپنے مرغ کو بھی کوسنے لگا۔

اوحرام کے پٹھے، گھر پھونک دیا تیرے باداموں کے عوض۔ بیوی میکے بھیج دی اور تُو نے مُنہ کالا کروادیا۔ ہت ترے حرام خور کی۔ اللہ قسم آج ذبح کر کے نہ کھایا تو شریفا لٹھ باز نہیں۔ لیکن مرغ نہ اُٹھا۔ جب چونچوں پہ چونچیں کھانے لگا تو بابا چراغ دین نے آگے بڑھ کر اپنا موتگیا پکڑ لیا، جس کی اپنی کلغی بھی خون میں نہا رہی تھی۔ اچھے نے شریفے کو دلاسا دیا اور اُس کا مرغ اُٹھا کر اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا، جسے لے کر وہ چپکے سے نکل گیا۔

اِدھر کا پورا مجمع چراغ دین کے گھر میں جمع ہو گیا اور لگے دُور دُور کی ہانکنے

میں نہ کہتا تھا، موتگیے کی رگوں میں جلالی خون ہے۔ خدا کی قسم دو منٹ اور نہ پکڑتے تو پٹا پھاڑ دیتا۔

دوسرا: بھئی چونچ میں کاٹ تو ذوالفقار ایسی ہے۔ مخالف کو کافر سمجھ کے لیتا ہے۔ خدا سلامت رکھے، بیسیوں لڑائیاں لڑیں اور برابر عزت رکھی۔

میاں موتگیا کوئی ایسا ویسا مرغ تھوڑی ہے۔ لکڑ دادا نے جب واجد علی شاہ کا دربار چھوڑا تو وہاں سے ایک مرغ ہی ساتھ لیا تھا۔ موتگیا اُسی کی نسل سے تو چلا آتا ہے۔ بابے چراغ دین نے آرام سے کلغی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجمعے کو مخاطب کیا۔ پھر تمام لوگ رشک سے اُسے دیکھنے لگے۔ آدھی رات تک وہاں مرغ بازی، بٹیر بازی اور کبوتر بازی پر ہی گفتگو رہی اور گڑ کے میٹھے چاولوں کی ضیافت بھی۔

....

گاؤں میں یہ واحد ایسا گھر تھا جسے آپ پورے گاؤں کا گھر کہہ سکتے ہیں۔ دو کنال کا کھلا احاطہ، جس کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی بلکہ کانٹے دار لکڑیوں کی باڑھ کر دی گئی تا کہ ملکیت کا پتہ چلتا رہے۔ اندر تین چار کمرے ہوں گے جن کی دیواریں گارے مٹی کی اور چھتیں گھاس پھونس کی تھیں۔ سردیاں آتیں تو بھینسیں بھی اُنہیں کمروں کے اندر بندھتیں۔ میں نے بابا چراغ دین کو کبھی کام کرتے نہیں دیکھا۔ جب بھی احاطے میں داخل ہوا، پہلے سیدھی نظر اُسی پر رُکتی۔ بڑی کلغی کا ایک اصیل مرغ گود میں ہوتا۔

چراغ دین کے اُوپر نیچے چھ بیٹے تھے جو باپ کے نقشِ قدم پر پورے چلے۔ انہوں نے گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ سینکڑوں کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے پھرتے، ہر جھونپڑے کی چھت پر چار چار کبوتر اُتارنے کی چھتریاں۔ جدھر دیکھو کنالیاں پڑی ہیں جن کے اندر کبوتروں کا دانہ پانی سوکھتا رہتا۔ اِدھر اُدھر بیسیوں کابکیں لٹک رہی ہوتیں اور ایک سے بڑھ کر ایک بٹیریں۔ شیشم کے پیڑ گھنا سایہ کیے رکھتے۔ گھر کے پہلو سے نالہ گزرتا جہاں سے سہ پہر کو خوب چھڑکاؤ کیا جاتا۔ درختوں کے سائے میں جب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تو بھیگی مٹی کی خوشبو دماغ میں اُترتی چلی جاتی۔ سائے اتنے گہرے تھے، جیسے سیاہ بادل اُمڈے ہوں۔

دن بھر جو چاہتا چلا آتا، حقہ پیتا، گپیں ہانکتا اور اُٹھ جاتا۔ اجازت کیسی؟ جب دیکھو بیس بیس لوگوں کا مجمع لگا ہے۔ کبوتر بازی اور کنکوے پر بحث چھڑی ہے۔ گھر کاہے کو تھا، ایک ڈیرہ کہہ لیجیے۔

چھ کے چھ بھائی صبح پانچ بجے اُٹھتے۔ نو بجے تک، چار گھنٹے ریت ڈھونے والی ٹریکٹر ٹرالی پر مزدوری کرتے۔ جو دریا سے شہر میں ریت لے کر جاتیں۔ نو بجے سے لے کر دن بارہ

بجے تک بھینسوں کا چارہ تیار کر لیتے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ دن کا بقیہ حصہ کھیل دھندوں اور کبوتر بازی میں نکلتا۔

میں چونکہ اُن کا پڑوسی تھا۔ دیوار سے دیوار ملی تھی۔ اس لیے اکثر اُدھر ہی رہتا۔ تیلی، اڈی کھنڈی، شطرنج، کون سی گیم ہے جو اُن سے نہیں سیکھی۔ ہاں تاش سے اُنہیں نفرت تھی اور یہ عمر بھر مجھے بھی نہ آئی۔

دن میں بیسیوں مرتبہ آپس میں لڑتے۔

دیکھ، میں نے کہہ دیا نا میرے کالسرے (کبوتر کا نام) کو ہاتھ نہ لگا ورنہ سر پھوڑ دوں گا۔

ہاں دیکھا میں نے تجھے۔ آیا کہیں نادر شاہ کا نطفہ۔ کالسرے کا تو کیا لگتا ہے؟

میں کہتا ہوں تو مجھ سے ابھی قتل ہو جائے گا (اپنی ماں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) مائی جیدے کو سمجھا لے ورنہ سمجھ لینا کہ تو نے ایک بیٹا پیدا ہی نہیں کیا۔

مائی چراغن نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں اور ایک سے بڑھ کر ایک تیز۔ اِدھر یہ کلہاڑیاں اور درانتیاں اُٹھا کر مقابل آ گئے۔ بس پھر کیا، پورا گھر دو حصوں میں بٹ جاتا۔ بابا چراغ دین کبھی ایک کے کھنڈی پر مارتا۔ کبھی دوسرے کے دھول جماتا اور آخر تھک کر بیٹھ رہتا مگر یہ ہیں کہ چھوٹ چھوٹ پڑتے۔ گالیوں کا شور اس قدر بلند اُٹھتا کہ پل میں سارا گاؤں اِن کے گھر ہوتا۔ کوئی ایک کو پکڑتا ہے کوئی دوسرے کو۔ بڑی مشکل سے جھٹ چھٹا ہوتا مگر اس سارے دنگے میں مجال ہے جو ایک چھڑی بھی کسی کو لگ جائے۔ خیر ابھی تو یہ عالم تھا اور ابھی پھر کنکوے پر بحث جاری ہے۔

شروع شروع میں تو لوگ گھبرا جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ ان کی لڑائی سے لطف لینے لگے۔ سچ پوچھیے تو اب وہ انتظار میں رہتے کہ دیکھیں کب تماشا لگتا ہے۔

وارث، جو سب سے بڑا تھا، کوئی بھی کام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اُس کے نیچے صادق عرف صادھا اور نیچے آ یئے تو گا گڑ۔ اس کا اصلی نام مجھے بھی یاد نہیں۔ چوتھے درجے پر جمیل، اس کا بھی اصلی نام خدا جانتا ہے۔ پانچواں ارشد عرف اچھا اور جیدا (جاوید) چھٹا ہوا۔ پہلے تینوں شادی شدہ اور میں نے ان گنہگار آنکھوں سے تینوں کو بیویوں سے پٹتے دیکھا۔ دو چار دفعہ نہیں، یہ روز کا معمول تھا۔ گاگڑ جسم میں تو ہاتھی تھا مگر جب بیوی جھاڑو پکڑتی تو یہ دوسرے بھائیوں کی پناہ

میں دوڑا آتا۔

گرمی اور جاڑے میں یہ آج تک امتیاز نہ کر سکے۔ جون جولائی کی دھوپ ہو یا کڑا کے کی سردی، لباس میں تبدیلی یا پاؤں میں جوتے کبھی نہ رکھے۔ لباس کیا، ایک دھوتی اور کرتہ۔ اس سے آگے اللہ ہی اللہ۔

اس معاملے میں باپ بیٹوں کا دستور ایک ہی تھا۔

ہر فرد چوہدری سے لے کر مُسلّی تک برابر اِن کا دوست تھا۔ بارہا میں نے دیکھا کوئی دو فرد آپس میں لڑے تو یہ آدھے ایک طرف ہو گئے اور آدھے دوسری طرف۔ خود بھی مخالف پارٹیوں کی طرف سے ہو کر لڑنے لگے۔ یہ ترکیب ایسی کامیاب رہتی کہ لڑائی لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ ہمارے گاؤں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو گا جو اِن سے بڑھ کر مفلس ہو مگر یہ ہیں کہ تمام گاؤں کو اپنے سے زیادہ مفلس جانتے تھے۔ سردی کا موسم نعمت تھا۔ دیسی سرسوں کا ساگ جو وسطی پنجاب کے دیہاتوں میں عام ہوتا ہے اور بلا قیمت حاصل ہونے والی سبزی ہے۔ قریب قریب دو ماہ بلا ناغہ پکتا۔ جب دیکھو چولہے پر ہنڈیا چڑھی ہے۔ اُس کے ساتھ روٹی کا تکلف بھی کم ہی کرتے۔ بس صبح، دوپہر، شام ساگ کھائے جاتے ہیں اور گنے چوستے ہیں کہ اس علاقے میں یہ بھی عام اور مفت ہیں۔ گرمی کا موسم اِن پہ اگرچہ مشکل گزرتا مگر کسی نہ کسی زمیندار سے ایک کنال زمین لے کر سبزیاں اُگا لیں اور تمام گرمیاں گزار دیں۔

کوئی مانگنے والا آیا تو کمال نیاز مندی سے ایک دوسرے کو کہتے، دو یار اِسے، بیچارا غریب ہے اور اُٹھا کر کچھ دے دیتے۔ جیسے حاتم کے سر پہ جوتے۔

سونے کے لیے کھلے صحن اور تاروں کی چھاؤں میں چارپائیاں لگ جاتیں۔ پھر آدھی رات تک ایسے ایسے بول اُٹھاتے کہ مزا ہی تو آ جاتا۔

پانی چمک کے جاندیے تارے نی لگ لوے ہلارے
تینوں سد دا یار غلاما تے کھڑی ہو کے گل سُن جا

غرض دوہے، ٹپے اور ہیر وارث شاہ ایسے سُر میں پڑھتے کہ واہ کہتے ہی بنتی۔ اِدھر ایک بھائی نے دوہا بولا، دوسرے نے گرہ لگائی۔ دُور کی نکڑ میں پڑی چارپائی پر لیٹے ہوئے تیسرے نے اگلا مصرعہ اُٹھا دیا اور دوہا مکمل۔ باپ سمیت ساتوں ایک کے بعد ایک دوہے اور ٹپے اُونچی

آواز میں بولتے اور لوگ اپنے گھروں میں پڑے سنتے۔

چور اُچکے اِن کی وجہ سے گاؤں میں آتے ہوئے ڈرتے۔ ذرا کوئی آدمی بازار سے گزرا نہیں کہ انہوں نے چور چور کا شور مچایا۔ لیجیے، اب تو گاؤں کے مُردے بھی جاگ اُٹھے اور چور کو بھاگتے ہی بنتی۔

کبوتر باز چاہے ولی ہو مگر ایک عیب اُن میں ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک عیب ہزار عیبوں کی جڑ، کہ جا دبے جا دیواریں پھلانگتے پھرنا۔ اس میں اچھے کو کمال حاصل تھا۔ چار میل پر اُڑتا کبوتر بھی اس کی نگاہ سے نہ بچتا۔ بس ایک دفعہ نظر آنے کی دیر ہے پھر تو یہ جادہ جا آخر پکڑا جاتا۔ چاہے دشمن کی دیوار پر کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اس معاملے میں بہت دفعہ سبکی بھی ہوئی۔ سردار نبی احمد سیال کی بیوی صحن میں چارپائی کھڑی کر کے اور اُس کی ایک طرف سے اوٹ لے کر نہا رہی تھی کہ اچھا ایک کبوتر کے تعاقب میں دیوار پھلانگ کر سیدھا اُس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ وہ بچاری کپڑے ڈھونڈتی رہ گئی اور یہ چارپائی کے پائے پر بیٹھے کبوتر کو دبوچ کر اُنہی قدموں واپس دوڑ آیا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ شام کے وقت خوب ہنگامہ ہوا۔ دونوں طرف سے لاٹھیاں نکل آئیں مگر حاجی لطیف نے بیچ پڑ کر معاملہ دبا دیا اور معافی تلافی سے بات ختم ہوئی۔ اسی طرح بہت دفعہ پنچایتیں ہوئیں مگر یہاں عادت کی مجبوری کہ ایک بار کبوتر پکڑنا ضرور ہے۔ جس دن آسمان صاف اور نیلا ہوتا جو گاؤں میں اکثر ہوتا ہے، اُس دن تو دو چار کبوتر ضرور پکڑ آتے۔

یوں تو کون سا قصبہ یا دیہات ہے جو کبوتر بازی سے ماورا ہے مگر جیسا شوق اس کا ہمارے علاقے میں تھا، اور دھ میں کہاں ہوگا۔ خاص کر چراغ دین کا گھر تو اس واسطے موزوں ترین تھا۔ ہمارا گاؤں جس کے ارد گرد تیس پینتیس گاؤں اور تھے اُن میں کوئی پانچ سو کے لگ بھگ کبوتر باز ہوگا، جو ہمارے گاؤں کے سکول میں ہر سال پندرہ جون کو اپنے اپنے کبوتروں کے ساتھ جمع ہو جاتے۔ سکول کی بڑی گراؤنڈ جو پانچ ایکڑ پر محیط، اس کام کے واسطے جگہ قرار پاتی۔ صبح آٹھ بجے شرطیں بندھ جاتیں اور کبوتروں کی ڈاریاں فضا میں بلند ہو جاتیں۔

کالسرے، چپٹے، چینے، بلوے، جونسرے، دُم چیرے، ڈبے، اُلٹے اور نہ جانے کن کن نسلوں کے رنگ برنگے ہزاروں کبوتر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں حسین رنگ بکھیر دیتے۔ آسمان ایک دلہن کی طرح نکھر جاتا۔ پتہ نہیں اس دن گرمی کی شدت کہاں چلی جاتی۔ ہم ننگے پاؤں

دوڑتے پھرتے۔ کبوتر باز تو ایک طرف کہ وہ تو اپنے کبوتروں کا پیچھا کرنے کے لیے دوڑتے ہی تھے۔ ہم خود لڑکے بالے جس کبوتر میں دلچسپی لیتے، اُسے دیکھنے کے لیے کوسوں فاصلہ بغیر تھکے طے کر جاتے۔ اس کے علاوہ کبوتر بازوں کے چٹکلے الگ تھے۔

دیکھ خان محمد، تیرا ڈبا بیٹھیں کر رہا ہے۔ زمین پر ابھی آیا کہ آیا، اچھے نے کہا۔

جالندھورے اپنا کام کر، پانچ من بادام کھلائے ہیں۔ زمین پر آنے والا نہیں۔ آسمان پر جائے گا آسمان پر، تُو اپنے جونسرے کی خبر لے۔ اُس کی دُم خدا کی طرف ہو گئی۔ خان محمد آنکھ تیزھی کر کے بولا۔ ابھی آدھ گھنٹے میں قصہ فیصل ہو جائے گا۔

دوسری طرف سے شفیع چبوترے والا بولا، خان محمد یہ ڈبا تو زرا مرغی ہے۔ تیرے بادام تو آج حلال کرنے سے رہا البتہ چاقو میں لے آیا ہوں۔ یہ لے گرتے ہی اس کے پھیر دینا۔

ہاں دیکھا ہے میں نے تیرے غلوے کو۔ کبوتر کا ہے کو، بٹیر پال رکھی ہے بٹیر۔ دیکھ تو سہی ایسے اُڑ رہا ہے جیسے ٹی بی کا بیمار ہو۔

ادھر رشید امصری نے ہانک لگائی (اس کی جیب میں ہر وقت مصری ہوتی) ابا کی قسم، کبوتر نہیں، ہمارا کالسرا جنگرا ہے جنگرا، دیکھو تو ہر چکر میں چندرہ فٹ اوپر نکل جاتا ہے۔ نیچے اُڑنا تو اس کے لیے شرم کی بات ہے۔

ہاں اللہ میاں سے کچھ دنیاوی معاملات طے کرنے جا رہا ہے۔ جمیل نے ایک طرف سے پھبتی کس دی، دیکھنا ایک نہیں بجے گا اور یہ زمین چاٹ لے گا۔

ادھر تو یہ نوک جھونک جاری ہوتی اُدھر حمید امرائی ڈھول بجائے جاتا ہے۔ کچھ لونڈوں کا اس کے گرد حلقہ جما ہے۔ سارے دن کی گہما گہمی عید کا سماں باندھ دیتی الغرض دن کا نصف حصہ تو انہی لطیفوں میں گزرتا اور داد کے ڈونگرے برستے مگر ایک بجے کے بعد کبوتروں کے ساتھ کبوتر بازوں کے چہروں کا رنگ بھی اڑنا شروع ہو جاتا۔ جس کا کبوتر بیٹھ جاتا، وہ کبوتر باز بھی بیٹھ جاتا۔ پھر تو ایک کے بعد ایک، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا، والی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ نعرے اور چیخوں کی گونج کان پھاڑے دیتی۔ گویا ہمارے گاؤں میں جنگ کا ہنگامہ ہو۔ ایسے حالات میں اچھے اور جمیل کا نیلے پروں والا فضاؤں کو عقاب کے جذبے سے چیرتا دکھائی دیتا۔ آخر کوئی چھ بجے خمیس کر کے اُتارتے، شام میٹھے چاولوں کی دیگیں پکتیں اور بازی کے جیتے ہوئے پیسے ادھر

نکل جاتے۔ یہ ویسے کے ویسے، کہ مال جس راہ سے آیا تھا اُسی راہ نکل گیا۔ پچھلے کئی برسوں سے یہی معمول تھا۔

....

چوہدری لطیف اپنے بیٹوں کے ساتھ لندن گیا تو اُس نے اپنی چھ ایکڑ زمین اچھے کے حوالے کردی اور ہدایت کی کہ جو حصہ آئے سال بہ سال میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا۔ گاؤں چونکہ زرعی حیثیت سے بہت آگے تھا۔ دو نہریں گاؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتیں اور اُن سے نکلنے والے بیسیوں ندی نالے زمین کو سیراب کرتے۔ اسی لیے گاؤں سرسبز و شاداب اور سایہ دار درختوں سے بھر گیا۔ جدھر کو نظر کیجیے، برگد، پیپل، جامن اور آم کے درختوں کا ایک سلسلہ تھا۔ زمین کا ارشد کے ہاتھ لگنا تھا کہ یہاں چکر ہی اور ہو گئے۔ چھ بھائیوں نے وہ محنت کی، وہ پسینہ بہایا کہ پہلے سال ہی فصل دُگنا ہوئی۔ پھر کیا تھا؟ باداموں کے توڑے اور نیچے موتیوں سے پیالے بھر گئے۔

مکان اور اپنا نقشہ تو کیا بدلنا تھا البتہ کبوتروں، بٹیروں اور مرغوں کے مزید دن پھر گئے۔ اُس سے اگلی فصل پر نئی کابکیں اور چھتریاں بن گئیں۔ ایک بڑا ٹیپ ریکارڈر خریدا گیا۔ اب سارا دن اُس پر عالم لوہار، مہدی حسن اور نور جہاں سُنے جاتے۔ مزید دو سال گزرے تو ایک وی سی آر لے لیا گیا، جس پر سلطان راہی کی فلمیں چلتیں۔ ہر شام ایک جشن کا سماں ہوتا۔ کوئی دو سو آدمی اکٹھا ہو جاتے۔ حاجی کی فلم لگتی (سلطان راہی کو حاجی کہتے تھے) اور اس کے ہر ایکشن پر لٹھا اُٹھ اُٹھ کے گرتا۔ دوسرے دن فلم کی سٹوری ہر اس شخص کو سناتا جس نے رات فلم نہ دیکھی ہوتی اور یوں ایکشن بنا بنا کے سُناتا کہ مزا آجاتا۔ میں نے بہت دفعہ جی میں چاہا کہ کاش میں فلم نہ دیکھتا، اچھے سے سٹوری سُن لیتا۔ کبوتر بازی کے مقابلے بھی مزید زور و شور سے ہونے لگے۔

زمین کاشت کرتے چار سال گزر گئے۔ چوہدری سال بعد آتا تو یہ اس کا حصہ اُس کی جھولی میں لا رکھتا۔ چوہدری بجائے خود ایک نیک انسان تھا۔ وہ بھی سب وہیں غریبوں میں بانٹ دیتا۔

لندن میں اُس کے بیوی بچے عرصے سے رہ رہے تھے۔ وہاں اپنا گھر تھا اور سوائے ایک تنگی کے اُدھر کوئی مشکل نہ تھی کہ گھر کے کام کرنے والا ڈھنگ کا کوئی ملازم نہ ملتا تھا۔ اول تو مہنگے ہوتے۔ دوسری اُن میں خرابی یہ ہوتی کہ کام بھی ادھورا کرتے۔

پچھلے سال چوہدری گاؤں آیا تو عجیب خبر لا اُس نے اعلان کیا کہ وہ ارشد کے لیے

لندن سے ویزہ لایا ہے۔ خبر کیا تھی جنت کا پروانہ تھا۔ تمام گھر ناچنے لگا۔ خوشی میں آ کر کئی کبوتر اڑا دیے (شام کو دوبارہ پکڑ لیے جب جوش ٹھنڈا پڑا) اور ایک بھینس بیچ کر سارے گاؤں کی دعوت کی۔ نیا لباس خرید ا گیا جسے ارشد چینٹ شنٹ کہتا۔ گاؤں میں کون گھر ہو گا جہاں نہ گیا ہو۔ بُرا بھلا معاف کروایا اور ایک ایک کبوتر اور بٹیر کو ہاتھ پھیرا۔ سو سو بار چوما ایسے کہ خود ہمارے بھی آنسو نکل آئے۔ بارہ فروری کو لندن کے لیے رخصت ہوا تو پورے گھر پر یوں نظر ماری جیسے مرنے والا ہو۔ آدھا گاؤں رخصت کرنے آیا اور دھاڑیں مار مار کے روئے۔ خود میں اسے شہر تک چھوڑنے گیا۔

میاں سب سے پہلے میں تو اپنے شاہ مدار (مرغے کا نام) کے لیے پانچ تولے سونے کی پازیبیں بناؤں گا باقی کام بعد میں، بابے چراغ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

عارف جو بھینس کا دودھ دوہ رہا تھا۔ بولا لو اور سنو۔ یہ صرف پانچ تولے کو روتا ہے۔ میاں جی یہاں تو اب مرغے کے مرغے سونے کے آئیں گے۔

اوں، مرغے سونے کے آئیں گے! جیدا پھنکارا، ریت ڈھوتے ڈھوتے سینے میں ریت کی فیکٹری لگ گئی اور یہ مرغے خریدیں گے۔ میں تو اب پندرہ دن سے زیادہ کام نہیں کروں گا۔ پہلے اپنی تین چار ٹریکٹر ٹرالیاں خریدیں گے اس کے بعد باقی سب کچھ دیکھا جائے گا۔

جیسل جو ایک طرف کلہاڑے سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا، ٹریکٹر چلائے گا تیرا باپ؟ تجھے تو گدھی ہانکنا نہیں آئی۔ سب سے پہلے جونسرے کی گانی خریدی جائے گی۔

بکواس بند کر اوئے اونٹ کے تھوبڑے والے، گدھی ہانکے تیرا باپ، یہاں تو ایں جناب چاند گاڑی تک چلا لیتے ہیں، جیدا دوبارہ بولا۔

صاحب میرا تو ایک ہی فیصلہ ہے۔ عارف کہنے لگا، پہلے تو خریدیں گے کوئی دو ہزار ایکڑ زمین، پھر اس میں تربوز بوئیں گے اور جی بھر کے کھائیں گے۔ اُس کے بعد لاہور کا چڑیا گھر خریدیں گے، جہاں پر اپنی مرضی کے جانور رکھیں گے۔

پتر مجھے تو بس ایک ہیرے کا کوکا اور سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔ اس آخری عمر میں ہی کچھ تو شوق پورا کرلوں۔ مائی چراغن آٹا گوندھتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

مائی تو فکر نہ کر۔ صادق نے باپ کے ہاتھ سے حقے کی نے پکڑتے ہوئے کہا، تیرا

تابوت بھی سونے کا بنائیں گے بلکہ مصر سے خرید لیں گے۔ سُنا ہے اُن کے ہاں بڑے عمدہ تابوت پڑے ہیں۔

تابوت خریدا اپنی ساس کے لیے، اپنے سُسر کے لیے۔ تابوت خریدا اپنی اس چڑیل بیوی کے لیے۔" اور چمٹا پکڑ کر مارنے کو دوڑی" اُدھر وہ ہنستے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

الغرض بڑے بڑے منصوبے طے ہوئے، جس کے لیے برطانیہ حکومت کا پورا بجٹ بھی کم پڑ جاتا۔ ہر تیسرے دن خط لکھا جاتا۔ اُس میں روزانہ کی ڈائری، کبوتروں کا احوال، بٹیروں اور مرغوں کی تفصیل بتائی جاتی۔ اُدھر سے بھی بغیر تعطل کے برابر جواب آتا، جس میں بار بار اپنے کبوتروں کا ایک ایک کر کے حال پوچھا جاتا اور جب مئی کے پہلے ہفتے پچاس ہزار روپیہ آیا تو پورا گھر باؤلا سا ہو گیا۔ پیسے خرچ کرنے کی جگہ نہ سوجھتی تھی۔ سکیمیں بننے لگیں اور طرح طرح کے موضوع زیرِ بحث آئے۔ گاؤں کے ایک دو چوہدریوں سے بھی مشورہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ابھی تو ابتدا ہے۔ صرف یہ پچاس ہزار ہی تو نہیں، اس کے بعد بھی تو اب پیسے آتے رہیں گے۔ لہٰذا ان پیسوں سے تمام کبوتر بازوں کی دعوت کی جائے اور اب کے جون میں جو کبوتر بازی کا مقابلہ ہو اُس میں ایک شاندار جشن بھی منایا جائے، جس میں کسی اچھے گلوکار کو سُنا جائے۔ بس پھر کیا، پندرہ جون تو سر پر آ گیا تھا۔ جشن کے اشتہار چھپ گئے۔

اردگرد کے تمام گاؤں میں اطلاعیں کروا دیں۔ اور تمام تفصیل اچھے کو پہنچا دی گئی کہ اس دفعہ ایسا شاندار مقابلہ ہوگا، جو اِن کانوں نے سنا، نہ آنکھوں نے دیکھا۔ پھر دوسری طرف سے بھی خط پہ خط آنے لگے۔ یوں کرو اور وُوں کرو۔ جیسے جیسے دن قریب آتے گئے، اضطرار بڑھتا گیا۔ بابے چراغ دین کے گھر میں رونق دُگنی ہو گئی۔ ایک اٹھتا تو چار آ بیٹھتے اور وہ وہ قصے کہتے کہ پیشہ ور داستان گوؤں کے کان کاٹتے۔

....

صبح چھ بجے ہی کبوتر باز سکول کی گراؤنڈ میں جمع ہونے شروع ہو گئے (سکول میں اُن دنوں تعطیلات ہوتی تھیں) حمیدو مراثی ڈھول لے کر آ گیا، جس نے زور سے ڈھول پر تھاپ لگانی شروع کر دی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے ماشکی نے چھڑکاؤ کر دیا اور چارپائیاں بچھ گئیں۔ دیگوں کا سامان بہم پہنچایا جانے لگا۔ ساڑھے سات بجے تک تمام خلقت جمع ہو گئی۔ بابا چراغ دین سامنے

چار پائی پر بیٹھ گیا۔ شاہ مدار مرغ گود میں تھا۔ آج گاؤں کے چوہدری بھی صبح ہی سے آبیٹھے۔ ہر طرف اتنی گہما گہمی اور زور شور تھا جیسے شاہ کبیر کا میلا ہو۔

بابے چراغ دین نے سوچا اے کاش کوئی کیمرہ لگا ہوتا تو یہ سارا سماں اچھا لندن میں بیٹھا دیکھتا اور کتنا خوش ہوتا۔ بہر حال اگلے سال جب چھٹی پر آئے گا تو پھر ایسے ہی ایک جشن اور کرا دیں گے بلکہ اب تو ہر سال ایسا ہی جشن کرائیں گے۔

پورے آٹھ بجے ریگلے سے ایک پٹاخہ چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی ڈھول پر تھاپ پڑنے لگی۔ پھر نعروں کی گونج اٹھی ایسا شور بلند ہوا کہ کان پھٹنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی تمام کبوتر فضا میں بلند ہو گئے۔ اُس پر ڈھول کی تھاپ اور نعرے مزید زور پکڑ گئے۔ پٹاخے اور ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ یوں کہ ہر طرف شور ہی شور۔ کان جیسے کچھ سُنتے ہی نہ ہوں۔ پھر اچانک اس شور میں رکشے کی پھٹ پھٹ نے اضافہ کر دیا۔ جس میں سے نکلتے ہوئے اچھے نے یا علی مدد کا نعرہ لگایا اور بھاگ کر اڑتے ہوئے اپنے جو تسرے کو دیکھنے لگا۔ اچھے کا نعرہ سُن کر بابے چراغ دین کا دل بیٹھ سا گیا۔ اُس نے حسرت سے اپنے شاہ مدار کے پاؤں کی طرف دیکھا، جو پازیبوں سے خالی تھے۔

شریکا

"یہ سکھوا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ حرامزادہ سوئر کی طرح اکڑ کے چلتا ہے، اوپر سے گھورتا بھی ہے"۔ شوکا اس وقت غصے میں تھا۔

"شوکے! ذرا تحمل سے کام لو اور ٹھنڈے دل سے سوچو" دارا بولا۔

"دارے خاں! اب صبر نہیں ہوتا، بات حد سے نکل گئی" جاگیرے نے اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہا۔

"آخر یہ عاقل خاں ہماری ساری برادری سے طاقتور تو نہیں؟ کل کھوہ سے آتے ہوئے ٹانگیں توڑ دو"۔

"لیکن۔۔۔؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں" غفارے نے دارے کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عاقل خاں دن دیہاڑے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالے اور اب تو بات کمیوں کے منہ پر بھی آگئی ہے"۔

ڈیرے میں بیٹھا ہر شخص آج طیش میں تھا اس لئے بات دارے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑائی ہو اور بات آس پاس کے گاؤں میں بھی پھیل جائے مگر رات کے بارہ بجے ایک فیصلہ ہو گیا۔

سردار نتھا سنگھ کی قلعہ نما حویلی گاؤں کے مرکز میں تھی جس میں سکھوں کے پچاس گھر آباد تھے، جن کی اکثریت زمین داروں کی تھی۔ گاؤں میں زمین تو چودھری سردار محمد عرف دارے

خاں اور سردار احمد بخش کی بھی کافی تھی لیکن رعب داب نتھا سنگھ کا ہی تھا۔ سکھ، مسلمان کا تعصب بالکل نہیں تھا۔ گاؤں والے دکھ درد کے ساتھی اور صدیوں سے ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ الغرض زندگی امن سے چل رہی تھی کہ اچانک تقسیم کا عذاب آپڑا۔ ساری فاختائیں اڑ گئیں۔ نتھا سنگھ کو بھی حویلی چھوڑنا پڑی۔ چھکڑوں پر سامان لد گیا اور سارا قبیلہ لدھیانے کے لئے بیل گاڑیوں پر سوار ہو گیا۔ چلنے سے پہلے افراد گنے گئے تو معلوم ہوا کہ شیر سنگھ غائب ہے۔ ہزار ڈھونڈا مگر پتہ نہ چلا۔ آخر کار نذیرے تیلی نے خبر دی،

"سردار جی! شیر سنگھ مسجد میں بیٹھا مولوی جان محمد سے کلمہ پڑھ رہا ہے"۔

یہ سن کر سردار جی کے ہوش اُڑ گئے۔ خبر دھوئیں کی طرح اٹھی تو مائی دھیراں نے دو ہتھڑ پیٹا اور بین کرنے لگی۔ نتھا سنگھ نے جلدی سے دلبیر کو بھیجا کہ بھائی کو لے کے آئے۔ اس نے لاکھ منتیں کیں مگر اس کو نہ آنا تھا، نہ آیا۔

قافلہ تین دن رکا رہا، مائی باپو نے کیا کیا نہ سمجھایا، مگر شیر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کیس کٹوا، کڑا کرپان نتھا سنگھ کے منہ پر ماری اور مُسلا ہونے کا اعلان کر دیا۔ آخر سردار جی نے بیٹے کی ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ حویلی کی چابیوں کے علاوہ سوا ایکڑ زمین کے کاغذات بھی اس کے حوالے کیے۔ روتی پیٹتی دھیراں کے ساتھ باقی اولاد کو لیا اور لدھیانہ چلا گیا۔

ادھر گاؤں میں شادیانے بجنے لگے۔ مولوی جان محمد نے شیر سنگھ کا نام عاقل خاں رکھ دیا کہ اس نے مسلمان ہو کر بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ دوزخ اور ہجرت دونوں سے بچا۔

نتھا سنگھ کی حویلی جواب عاقل خاں کے پاس تھی، کی دیوار دارے خاں کے چھوٹے بھائی جمال دین کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ شیداں اسی جمال دین کی بیٹی ناک نقشے کی درست، بے باک طبیعت کی مالک تھی۔ ادھر یہ بیس سال کا خوب صورت جوان تھا لہٰذا کبھی یہ دیوار سے اُدھر کبھی وہ دیوار سے ادھر۔ تقسیم کو تین سال ہو گئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یوں آرام سے نبھ رہی تھی کہ ایک دن عاقل خاں نے جانے کیا سوچ کر جمال دین سے رشتہ مانگ لیا۔ اس وقت چودھری پید کے اور انہیں معاملے کی سنجیدگی کا علم ہوا۔

فوراً انکار کر دیا بلکہ لین دین بھی ختم کیا۔ اس نے بڑا زور مارا لیکن کوئی بس نہ چلا۔ لاکھ زمینوں والا سہی، آخر ہے تو سکھ کا بیٹا، چودھری رشتہ دے کر زمانے کو کیا منہ دکھاتے۔

بالآخر شیداں دارے خاں کے بیٹے شوکے سے بیاہ دی گئی۔ مگر یہ بھی نچلا نہ بیٹھا، برابر ملتا رہا۔ پانچ سال ہونے کو آئے، اُس کے دو بچے ہو گئے مگر اِدھر وہی جذبہ بلکہ اب تو احتیاط بھی کچھ باقی نہ رہی اور بات دُور تک نکل گئی۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہنے لگے کہ بچے شوکت سے نہیں، عاقل خاں سے ہیں۔

شوکے نے شیداں کو لاکھ مارا پیٹا، کئی دفعہ عاقل خاں کو بھی دھمکایا لیکن نتیجہ سوائے بدنامی کے کچھ نہ نکلا۔ کئی دفعہ چودھریوں کی نیت بدلی مگر عملی کارروائی نہ کر سکے۔ اس طرح کچھ وقت اور گزر گیا۔ آخر چودھری کہاں تک برداشت کرتے۔ اس لئے انہیں اب حتمی فیصلہ کرنا پڑا۔

وہ کھوہ پر پہنچا تو شبیر ابھینسوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوی جس کا دستہ چھ فٹ لمبے بانس کا تھا، شریہنہ کے تنے کے ساتھ لگا دی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا، میں بھی کوئی بزدل نہیں۔ آدھ سیر دیسی گھی تو میری ایک دن کی خوراک ہے۔ گاؤں میں بس یہ شبیرا ہی ایک ایسا ہے جو میرے مقابلے کا ہے لیکن یہ بھی میرا ہی آدمی ہے ویسے بھی جب یہ فیروز پور سے آیا تھا تو میں نے ہی اس کی مدد کی، رہنے کو اپنے کھوہ پر جگہ دی۔ آج سات سال ہو گئے، میری ہی زمین کاشت کرتا ہے۔

اُس نے سوچا یہ بھی اچھا ہی ہوا جو شبیرا میرے پاس ہی چلا آیا۔ گاؤں میں کوئی تو ایسا ہے جو میرا اپنا ہے۔ انہیں خیالوں میں گم تھا کہ شبیرا پاس آ بیٹھا۔ شبیرے کو دیکھ کر عاقل خاں اُٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، آخر عاقل خاں کی طرف دیکھتے ہوئے شبیرا بولا، ''بھائی عاقل خاں! آج کل چودھریوں کے تیور ٹھیک نظر نہیں آتے''۔

''لگتا مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے، پھر کیا کیا جائے؟'' عاقل خاں اُٹھتے ہوئے بولا۔

''کرنا کیا ہے؟ میں تو کہتا ہوں شیداں کا پیچھا اب چھوڑ ہی دے، کہیں نقصان نہ ہو جائے''۔ شبیرے نے دھیمے سے کہا۔

''شبیرے یہ نہیں ہو سکتا'' عاقل خاں بولا۔

''آخر کیوں نہیں ہو سکتا؟'' شبیرے نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اسی بے چاری کی خاطر تو میں نے واہگرو سے بے وفائی کی۔ دین دھرم

بدلا اور ساری برادری سے لعنتیں لے کر نسلا ہوا۔ جب سارا قبیلہ لدھیانے چلا گیا تو میں نے اسی کی خاطر گاؤں نہ چھوڑا اور شیر سنگھ سے عاقل خاں بنا، بے بے روتی پیٹتی چلی گئی"۔

کچھ دیر رک کر بولا، "پھر تو بھی تو میرے ساتھ ہے، ان کو پتا ہے کہ دو شیر سنبھالنے مشکل ہیں"۔

شبیرا یہ سن کر کچھ دیر چپ رہا، پھر کہنے لگا، "بھائی عاقل خاں! ٹھیک ہے میں تیرے ساتھ ہوں، آخر تجھے بڑا بھائی سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی احتیاط سے"۔

جب آٹھ دس دن فیصلے کو ہو گئے اور چودھریوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہ ہوئی تو عاقل خاں پھر حوصلے میں آ گیا۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ سردار احمد بخش نے پیغام بھیج دیا، جس کا دارے خاں سے شریکا تھا۔

"عاقل خاں! کوئی بات نہیں، حوصلہ رکھنا ہم تیرے ساتھ ہیں۔ آخر سردار نتھا سنگھ کو میں نے بھائی کہا تھا، آج اس کے بیٹے کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں گا"۔

ان باتوں سے عاقل خاں پہلے سے بھی شیر ہو گیا اور کھل کھیلنے لگا اور بات یہاں تک پہنچی کہ چودھریوں کے محلے سے گزرتے ہوئے اونچی اونچی کھانستا اور طرح طرح کے آوازے بھی کسنے لگا۔

"سن دے سی گے، میدان لگنا وا۔ پر چپ چاند ای ہو گئی آ۔ پیا! شیراں نال میدان لانے کوئی سوکھی گل آ۔ پن سیری کلیجہ چاہی دا، پن سیری"۔

آج تو چڑی تھی۔ گاؤں کی غریب عورتیں اور بچے عاقل خاں کے کھوہ پر جمع تھے۔ عاقل خاں بھینسوں کا دودھ اُن میں تقسیم کرنے لگا۔ ہر نوچندی کو دودھ تقسیم کرنے کی رسم اس کے دادے سردار موہن سنگھ سے چلی آتی تھی۔ جب شام کا جھٹپٹا سا ہو گیا، عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو عاقل خاں کچھ دیر بیٹھ کر حقہ پیتا رہا پھر اُس نے ایک ہاتھ میں اپنی چھوی اور دوسرے میں کتیا کی زنجیر پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے شبیرے کو آواز دی (آج اُس نے رہٹ چلایا ہوا تھا)۔

"لے شبیرے رب راکھا، میں چلیا، تو اج کمادوں پانی لا کے سونا"۔

شبیرے نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ بے فکری سے چلتا ہوا جیسے ہی چودھریوں کے محلے کے نکڑ پر پہنچا، کچھ جوانوں نے راستہ روک لیا۔

شوکا سب سے آگے تھا۔ اس نے کہا: "لے عاقل خاں! ہم نے آج پن سیری کلیجہ کرلیا اور میدان میں بھی آگئے، تو سنبھل لے"۔

عاقل خاں ایک دفعہ تو گھبرا گیا لیکن جلدی خود کو سنبھالا۔ کتیا کی زنجیر کھول دی اور چھوی کو مضبوطی سے پکڑ کر ڈٹ گیا۔

ڈانگوں اور چھویوں کا مینہ برسنے لگا۔ عاقل خاں بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ ڈانگوں کے کھڑکنے کی آواز دور تک سنائی دینے لگی۔ جس کی دھمک شبیرے کے کان میں بھی جا پڑی۔ اُس نے سوچا، ہو نہ ہو، چودھری، عاقل خاں سے بھڑ گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنی ڈانگ پکڑی اور امداد کو بھاگا۔

لڑائی تو دو منٹ میں ہی ختم ہو جاتی مگر عاقل خاں کی کتیا غضب کی نکلی۔ اُچھل اُچھل کر چودھریوں کو کاٹنے لگی۔ ادھر عاقل خاں کے ساڑھے چھ فٹ قد اور لمبے دستے والی چھوی نے بھی بڑا کام کیا۔ دو تین چودھری زخمی کر کے گرا دیے مگر کہاں تک۔ آخر پانچ منٹ بعد ہی عاقل خاں بھی گر گیا۔ شبیرا پہنچا تو چودھری جا چکے تھے۔ باقی خلقت موجود تھی۔ شبیرا چودھریوں کو گالیاں دیتے ہوئے جب عاقل خاں کے نزدیک آیا اور اُسے اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ اُٹھ نہ سکا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور کتیا پاس کھڑی زخمی حالت میں شدت سے بھونک رہی تھی۔

خیر دس بجے کے قریب شبیرے نے عاقل خاں کو شہر کے ہسپتال پہنچایا۔ علاج شروع ہو گیا۔ دوسرے دن رپٹ درج کرا دی اور مقدمہ چل پڑا۔

ادھر شبیرے کی توجہ اور گھی دودھ کی بدولت عاقل خاں کے زخم جلد ہی بھرنے لگے۔ یہاں تک کہ چند ماہ میں ہی دوبارہ چلنے پھرنے لگا مگر ٹانگوں میں ایک لنگ سا پیدا ہو گیا کہ دور سے ہی عیب ظاہر ہو جاتا تھا۔ یعنی وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ پھر بھی اس نے بد دلی ظاہر نہ ہونے دی اور بجائے پیدل چلنے کے گھوڑے پر بیٹھ کر کھوہ پر آنے جانے لگا۔

دوسری طرف چودھریوں نے ٹانگیں تو توڑ دیں مگر شبیرے اور احمد بخش نے انھیں کیس

میں ایسا اُلجھایا کہ جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ مقدمہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ سالوں لمبا ہو گیا۔ ادھر رفتہ رفتہ عاقل خاں کا عشق بھی سرد پڑ گیا۔ کیونکہ ایک تو جسم میں وہ تاب نہ رہی اور دوسرا مقدمے کے اُلجھاوے نے توجہ بانٹ دی مگر ایک کسک سی دل میں اب بھی باقی تھی۔

پھر ایک دن کچھ لوگوں نے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دی جس میں چودھریوں کو کچھ تاوان پڑ گیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ نہ جانے کیوں عاقل خاں اب بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ وہ بات بھی کم کم ہی کرتا۔ بڑی دفعہ شبیرے نے حوصلہ بھی دیا مگر اُس پر ایک اداسی چھائی رہتی۔ اب وہ رات کو اکثر گاؤں آنے کے بجائے شبیرے کے پاس کھوہ پر ہی رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی چپکے سے رو بھی لیتا۔ اس طرح کئی سال مزید گزر گئے۔ آخر ایک دن شبیرے سے کہنے لگا، "شبیرے! کچھ دنوں سے بے بے بہت یاد آ رہی ہے۔ اُس کا جاتے وقت کا روتا ہوا چہرہ آنکھوں سے نہیں ہٹتا۔ جانے کیوں آج میرا دل کرتا ہے پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اب تو کئی سال خط آئے کو بھی ہو گئے پتا نہیں چھوٹی جیناں کا کیا حال ہو گا۔ بختاں ماری بیاہ دی گئی ہو گی۔ جانے گی تو میری ٹانگوں سے چمٹ گئی کہ ویرے کو ساتھ لے جاؤں گی۔ واہگرو کی سونہہ، رات کو نیند نہیں آتی"۔

کچھ دیر رک کر آنسو پونچھتے ہوئے پھر بولا، "شبیرے! کوئی سب کچھ مجھ سے لے لے پر مجھے باپو اور بے بے تک پہنچا دے"۔

عاقل خاں کی باتیں سن کر شبیرے کے بھی آنسو نکل آئے۔ اُسے بھی اپنے ماں باپ یاد آ گئے جو اٹھارہ سال پہلے فیروز پور سے آتے ہوئے بلوے میں مارے گئے تھے۔

پھر ایک دن عاقل خاں نے تحصیل جا کر دس ایکڑ زمین شبیرے کے نام کر دی اور لدھیانے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقل خاں اپنی زمین بیچ کر لدھیانے جانا چاہتا ہے۔ بات جونہی احمد بخش کے کان تک پہنچی اُس نے زمین خریدنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اتنی اچھی اور ٹکے کی زمین ہاتھ آنے کا اس سے اچھا اور سستا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ اُس نے عاقل خاں سے کہا، "عاقل خاں! سردار نتھا سنگھ میرا بھائی بنا تھا اس لئے پہلا حق میرا ہے"۔ خیر عاقل خاں احمد بخش کے ہاتھ زمین بیچنے کو تیار ہو گیا۔ اُدھر چودھریوں کو پتا چلا تو وہ پیچ وتاب کھانے لگے۔ احمد بخش کا عاقل خاں سے زمین خریدنا اُنہیں بالکل گوارا نہ تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ عاقل خاں دارے خاں کو زمین کبھی نہ دیتا، یہ دارے خاں کو بھی پتہ تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد تو مسجد کے دروازے پر اس زمین کے معاملے میں چودھری دارے خاں اور احمد بخش کے درمیان کافی لے دے بھی ہوئی اور دارے خاں نے احمد بخش کو یہاں تک دھمکی دے دی کہ تُو ہمیں نہیں جانتا۔ شریکے کے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ زمین ہماری زمینوں کے ساتھ پڑتی ہے اس لئے زمین خریدیں گے تو ہم ہی۔ اس پر سردار احمد بخش تمسخرانہ انداز میں ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرے دن احمد بخش رقم اور گواہ لے کر تحصیل پہنچ گیا کہ شام اُس کے ساتھ عاقل خاں کی بات پکی ہوگئی تھی لیکن اُس نے دیکھا کہ دارے خاں کچھ آدمیوں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور پھر یہ سُن کر تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا کہ عاقل خاں نے کچھ ہی دیر پہلے زمین دارے خاں کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ احمد بخش نے عاقل خاں کی طرف مڑ کر بگڑتے ہوئے پوچھا: "یہ تو نے کیا کیا، تجھے حیا نہ آئی؟

اس پر عاقل خاں نے سر جھکا کر کہا،" چاچا احمد بخش! رات دارے خاں کے ساتھ وہ آئی تھی اب تو ہی بتا، میں شیداں کی بات کیسے ٹال دیتا؟"

maablib.org

تابوت

مجھے دیکھتے ہی آفتاب بولا، یار علی دو منٹ پہلے آ جاتا تو کیا اچھا تھا۔ اس کمینے نے آج مجھے تیسری دفعہ مات دی۔ یہ اتنا بڑا سوئر ہے (اگلا لقمہ ڈاکٹر نے اُچک لیا) کہ ایک کتے سے قابو نہیں آتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر منور بیگ ہم دونوں کی نسبت اچھا شاطر تھا۔ پھر بھی میں اور آفتاب مل کر اس پر حاوی ہو جاتے۔ منور بیگ کا کلینک گاؤں کے چوک میں واقع تھا جس کے ایک طرف جامع مسجد اور سامنے پکی اور صاف ستھری سڑک گزرتی جس پر ٹریفک بالکل نہ تھا مگر سارا دن اکا دکا آدمی ضرور گزرتے رہتے۔ سڑک کی دوسری طرف پارک تھی۔ جس میں چھ سات کھجور کے اُونچے درخت بھی تھے جو دیکھنے والے کو بھلے لگتے۔ سڑک اور پارک دونوں ویران تھے۔ غالباً گاؤں کے لوگوں کا ایسی چیزوں میں دھیان نہیں رہتا۔ میرا اور آفتاب کے دن کا بڑا حصہ کلینک پر ہی گزرتا۔ ڈاکٹر اچھا شاطر ہونے کے علاوہ حاضر جواب اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ اُس سے بات کر کے آسان نکل جانا مشکل تھا۔ ہر فن مولا ایسا کہ گھر کا چولہا بنانے سے لے کر مریضوں کی دوائیاں تک خود تیار کر لیتا۔

آفتاب کے پاس امریکہ کا گرین کارڈ تھا۔ گرمیوں میں چلا جاتا۔ چھ سات مہینے مزدوری کرتا اور نومبر چڑھے لوٹ آتا۔ پچھلے بیس سال سے یہ اس کا معمول تھا۔ سرطان کا مریض بھی تھا۔ لہٰذا ڈاکٹروں نے اسے سگریٹ منع کیے تھے۔ گھر سے باہر آتا تو بیگم چھوٹا لڑکا ساتھ کر دیتی کہ ابا کا خیال رکھے اور سگریٹ پینے پر اُسے خبر کرے۔ اِدھر اس نے بچے کو رشوت پر لگا دیا کہ ہر سگریٹ کے پانچ روپے لے لیا کرے مگر اپنی امی کو نہ بتائے۔

ہم آفتاب سے اکثر امریکی معاشرے پر بات کرتے۔ جسے وہ مزے لے لے کر سناتا کہ ایک دفعہ فلاں سے عشق کیا تو یہ گزری۔ فلاں سے عشق ہوا تو یہ بیتی۔ ہمیں بتاتا کہ امریکیوں کا

دل اتنا کھلا ہے کہ ایک لڑکے سے جو میرے ساتھ کام کرتا تھا اُسے میں نے کہا یار، تمہاری بہن کیا غضب کی خوبصورت ہے۔ بولا آپ کی اُس سے بات کراؤں؟

میں نے کہا، نیکی اور پوچھ پوچھ کر، بھلائی میں دیر کیسی؟ میاں جلدی کرو لیکن پتا چلا کہ پہلے ہی اُس کا ایک بوائے فرینڈ ہے، جس کا ہم دونوں کو بہت افسوس ہوا بلکہ اُسے غیرت بھی آئی اور طیش کھا کر دو دن تک نہ بولا۔

امریکی قانون پر بات کرتے ہوئے اُس نے کہا قانون سخت ہے لیکن امریکی ڈاکو اِس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ میں نے پوچھا اُدھر کبھی لٹنے کی سعادت ہوئی؟ بولا مجھے کسی نے نہیں لوٹا البتہ اُن کے ہاتھوں فائدہ ہوا۔ قصہ یہ کہ میں ایک پٹرول پمپ پر ملازم تھا۔ میرے پاس پٹرول کے تقریباً چار ہزار ڈالر جمع ہو گئے کہ اتنے میں ڈاکو آ گئے۔ انہوں نے تمام افراد کو لوٹ لیا۔ خوش بختی سے میں پیسوں سمیت ٹائلٹ میں جا گھسا۔ ڈاکو چلے گئے تو باہر نکل آیا اور لٹنے والوں میں شامل ہو گیا۔ افراتفری میں کسی کو پتہ نہ چلا یوں میں اُس رقم کا مالک بن گیا۔ اُس دن خدا کی قسم مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا۔

ایک دن حسب معمول ہم شطرنج اور چائے میں مشغول تھے کہ ایک مریضہ کو اُس کے لواحقین تانگے پر لاد لائے۔ مریضہ بے ہوش تھی اور لواحقین گھبرائے ہوئے۔ ڈاکٹر نے شطرنج جلدی سے میز کے نیچے چھپا دی اور مریضہ کو دیکھنے لگا۔ میں اور آفتاب اُٹھ کر باہر آ گئے اور پارک میں آ کر کھجوروں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ مریضہ نے کام خراب کر دیا ورنہ اس گیم میں ڈاکٹر پھنس گیا تھا۔ ڈاکٹر منور بیگ کچھ دیر مریضہ کو دیکھتا رہا لیکن اُس کی سمجھ میں غالباً کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر پریشانی کے عالم میں اُس نے لواحقین کو جواب دے دیا۔ اُن سے کہا کہ مریضہ کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے لہٰذا اِسے جلدی سے شہر لے جاؤ۔ ڈاکٹر کے جواب دینے پر لواحقین گھبرا گئے۔ وہ اِس گومگو کی کیفیت میں تھے کہ اتنی جلدی کیا کیا جائے۔ مریضہ کو دوبارہ تانگے پر رکھا گیا۔ تانگہ چلنے ہی کو تھا کہ آفتاب نے بھاگ کر مریضہ کی نبض پکڑ لی۔ پھر ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے پاس آ کر مریضہ کو دوبارہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اِس کیفیت میں مَیں دور ہی کھڑا رہا۔ غالباً یہ میری نفسیاتی کمزوری ہے کہ کسی کی تکلیف کو قریب سے نہیں دیکھ سکتا۔ ڈاکٹر اور آفتاب کو پریشان دیکھ کر ورثا سمجھ گئے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ مریضہ فوت ہو چکی تھی۔ کچھ راہ چلتے بھی کھڑے ہو گئے اور دلاسے دینے لگے۔ پانچ چھ منٹ میں تانگہ رخصت ہو گیا اور دس منٹ کے

اندر لوگ بکھر گئے۔ یہاں تک کہ ہم تینوں رہ گئے اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور بولا، کیوں علی صاحب بندہ کس صفائی سے مرتا ہے۔ میں چپ رہا مگر آفتاب نے سامنے سڑک کے اُس پار پارک میں بارش کے پانی میں تیرتی بطخوں کو دیکھتے ہوئے کہا، کم از کم مجھے اس طرح کا مرنا پسند نہیں۔ یہ کیا کہ مریض کو پتہ بھی نہ چلے اور وہ مر جائے۔ وہ بھی سڑک کے عین بیچ۔ امریکہ میں انسان اور حیوان دونوں ہسپتال میں مرتے ہیں اور اس صفائی اور آرام سے کہ تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ یوں تانگوں میں ذلیل نہیں ہوتے۔

اس بات پر منور بیگ نے سرد آہ کھینچی اور میں نے فقط سر ہلا دیا۔

ہمیں متاثر ہوتے دیکھ کر وہ مزید بولا۔ بس یار زندہ رہنے کا، مرنے کا اور مرنے کے بعد تک کا مزا امریکہ میں ہے۔ یہاں تو (ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے) نیم حکیم ہیں۔ تانگے ہیں یا جوہڑ کے گندے پانی جن میں بطخیں تیرتی ہیں۔ میں نے کہا اگر جینے مرنے کا مزا امریکہ میں ہے تو بالکل ہی اُدھر کیوں نہیں چلا جاتا؟ اِدھر کیا رکھا ہے؟ بولا، سوچا تو میں نے بھی ہے لیکن میری دو بیٹیاں ہیں۔ سوچتا ہوں گوروں سے آنکھ لڑا بیٹھیں تو کیا ہوگا اور قانون یہ ہے کہ والد تھپڑ مارے تو جیل جائے۔ البتہ اُن کو بیاہ کر جاؤں گا اور نہ آؤں گا۔ اس گفتگو نے ہماری افسردگی دور کر دی اور ہم یہ بھی بھول گئے کہ ابھی ابھی ہمارے سامنے کسی کی موت واقع ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے آفتاب کو پھر چھیڑا، یار یہ تو پتا چل گیا کہ جینے اور مرنے کا مزا مغرب میں ہے لیکن مرنے کے بعد تک کے مزے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یعنی یہ کہ امریکی خدا سے بھی ہاتھ کر گئے اور جنت بھی لے اُڑے۔

آفتاب میری طرف دیکھ کر ہنسا پھر بولا، جہاں تک جنت کا سوال ہے، امریکی تو ایک طرف ہم بھی فارغ ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ کھاتے ہوٹل میں ہیں، رہتے ٹھنڈ میں، مرتے ہسپتال میں اور دفن تابوت میں ہوتے ہیں۔ جب کہ یہاں کھاتے کچھ نہیں، مرتے سڑکوں پر اور دفن نہیں ہوتے بلکہ دابے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نے کہا، کیا تابوت مٹی میں نہیں جاتا؟

جاتا ہے، مگر تو نے تابوت نہیں دیکھا، آفتاب کہنے لگا۔ ایک اعلیٰ پائے کی لکڑی کا صندوق جس کے اندر ایلومینیم کا ایک اور صندوق، اس کے اندر شاندار کپڑا، جاڑے اور گرمی میں

مردے کا محافظ۔ بندہ صدیوں سوتا ہے اور مٹی کا منہ چڑاتا ہے۔ مجال ہے کفن کا تار بگڑے۔

اور یہاں؟ خدا پناہ، مذہبی فوجدار، غسال اور گورکن مردے سے گویا انتقام لیتے ہیں۔ ایک تو وہ بے چارہ مرتا ذلت سے ہے اور رہی سہی کسر یہ نکال لیتے ہیں۔ چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا، زمین پر چت لٹایا اور اوپر مٹی بھر دی۔ یعنی لاش اگر کل خراب ہونی ہے تو آج ہی ہو جائے۔ گرمیوں میں پسینے چھوٹیں اور سردیوں میں جاڑا مار دے۔ بھائی میرا تو یہاں مرنے کو دل نہیں کرتا۔ جہاں تابوت نہیں وہاں بندہ کیا خاک مرا بلکہ ذلیل ہوا۔

بس کرو میاں، ڈاکٹر کہنے لگا، ہمیں تو افسوس ہوتا ہے کہ ابا انگریز کیوں نہ ہوئے؟ کاش امریکی ہوتے۔ چاہے سوچی ہوتے۔ اب تابوت سے بھی رہے اور خوف آنے لگا ہے کہ ابھی مرے، ابھی خاک ہوئے۔ بھائی اب کے جاؤ تو دو تابوت بھجوا دینا ہم پر احسان ہوگا۔ اسی چھیڑ چھاڑ میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ میں اور آفتاب اُٹھ کر چلے آئے۔

دوسرے دن میں کسی ملازمت کے حصول کے سلسلے میں شہر چلا گیا وہاں دو ماہ رہا۔ اس دوران ڈاکٹر اور آفتاب سے ملاقات نہ ہو سکی البتہ دو چار بار فون پر بات ضرور ہوئی۔ ملازمت چونکہ اچھی نہ تھی اور دوسری وجہ یہ کہ گاؤں یاد آنے لگا۔ لہٰذا جلد ہی لوٹ آیا۔ چار بجے کلینک پر گیا تو دونوں گپیں ہانک رہے تھے۔ میرے جاتے ہی منور بیگ نے بساط پر مہرے لگا دیے۔

کھیل کے دوران ڈاکٹر بولا، چلو یار آج تمہیں جان بوجھ کر جتوا دیتا ہوں کیونکہ کل آفتاب چلا جائے گا۔ کیا کہے گا جاتے جاتے بھی ہار گیا۔

میں نے کہا بعض لوگ جا کر بھی ہار جاتے ہیں۔

یہ لوگ (آفتاب کی طرف اشارہ کر کے) نہایت کمینے ہیں، ڈاکٹر کہنے لگا، ہار کر بھی کچھ نہ کچھ لے اُڑتے ہیں۔

اور آپ سید زادے ہیں۔ آفتاب نے شاہ کو چیک دیتے ہوئے کہا کہ ہر طرف عنایات کی بارش ہے۔

بھڑوے تجھے شاطر کر دیا۔ سگریٹ، چائے اور کھانسی ہمارے لطف کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا۔ ہماری صحبت میں ہی بیٹھنے سے تمہیں عقل آئی۔ اب لوگ تجھے اچھا بھلا دانشور سمجھتے ہیں۔ گویا اب تُو چلتا پھرتا کامریڈ ہے۔

اس پر آفتاب ڈاکٹر کو ٹک ٹک دیکھنے لگا۔

یوں ہم سارا دن ہنستے رہے جب کہ گاہے گاہے ڈاکٹر مریض بھی دیکھتا رہا۔ دوسرے دن ہم آفتاب کو ایئر پورٹ پر چھوڑ آئے کیونکہ یہ اُس کا امریکہ جانے کا دن تھا۔

آفتاب کے جانے کے بعد میں اور ڈاکٹر گاؤں میں ہم مجلس رہ گئے۔ چار پانچ دن بعد آفتاب کا فون بھی آجاتا اور کافی دیر تک ہماری باتیں ہوتی رہتیں ڈاکٹر فون پر ہی اُس کی اچھی بھلی خبر لے لیتا۔ دو ماہ اسی طرح نکل گئے مگر پچھلے کوئی بیس دن سے اُس کا فون نہ آیا۔ ہم تھوڑے سے پریشان ہوئے کہ ایسا بے صبر آدمی تو نہ تھا، خدا جانے کیا بنی۔

ایک دن میں نے آفتاب کے بیٹے شہزاد سے پوچھا، تیرے ابا کا فون نہیں آیا؟ اُس نے کہا وہ اُدھر ہسپتال میں داخل ہیں۔ آج پندرہ دن ہو گئے، تکلیف اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ وہ بات نہیں کر سکتے۔ یہ بتاتے ہوئے وہ رو پڑا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر کو آ کر بتایا۔ اُس دن ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ شطرنج کھیلنا بھول گئے۔

پارک میں کھڑا بارش کا پانی اب خشک ہو چکا تھا اور بطخوں کی جگہ آوارہ کتوں نے لے لی جو ایک دوسرے کو غرا رہے تھے۔

اگلے دن رات ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا۔ اعلان ہوا کہ آفتاب امریکہ میں کسی ہسپتال میں داخل تھا، جو آج رات نو بجے فوت ہو گیا۔ میں دوڑ کر آفتاب کے گھر کی طرف گیا۔ ڈاکٹر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ آفتاب کے بیوی بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہوئے تو آفتاب کے بچے ہم سے لپٹ گئے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ ہمارے پاس دلاسا دینے کو الفاظ نہ تھے فقط آنسو نکل آئے۔ دوسرے دن آفتاب کے بھائی اور رشتہ دار بھی آ گئے، جن میں سے ایک ملک کا مشہور فلمی ایکٹر بھی تھا۔ تیسرے دن لاش آ گئی جسے دیکھ کر ہم ایک دم چونک گئے۔

لاش ایک بڑے اور خوبصورت تابوت میں تھی۔ میں اور ڈاکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مگر چپ رہے۔ لاش آنے پر پورا گاؤں اُمڈ آیا۔ جونہی تابوت کھولا گیا ایک کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں دردناک تھیں۔ اُس کے بیوی بچے لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ ہم پر بھی رقت طاری ہو گئی اور آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ فضا اس قدر بوجھل اور ماحول ایسا دردناک تھا کہ ہم زیادہ دیر تک لاش کے قریب نہ ٹھہر سکے۔ علاوہ ازیں رفتہ رفتہ عورتوں کا ہجوم

بڑھنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم لاش سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور تعزیت میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگے۔ جو پلٹتے ہوئے تابوت کا ذکر ضرور کرتے کہ کتنا خوبصورت اور چاندی سے زیادہ سفید ہے۔ عورتیں اُس کے اندر کے کپڑے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

نوجوانوں اور بچوں کا الگ ہجوم فلمی اداکار کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ وہ اتنے بڑے فلم سٹار کو پہلے سکرین پر ہی دیکھتے رہے لیکن آج اُسے عین آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ آفتاب کی لاش سے اُنہیں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ اُس کی موت نے انہیں یہ موقع فراہم کیا۔

اِدھر آفتاب کے بھائیوں اور رشتہ داروں کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کی وجہ سے امریکی تابوت اور معروف اداکار کو لوگ دیکھ سکے۔ اِس عالم میں آفتاب کے بیوی بچے ہی صرف وہ لوگ تھے جنہیں تابوت دکھائی نہ دیا۔ خاص کر پانچ روپے رشوت لینے والے بیٹے کو جو بالکل لاش کے اوپر لیٹا چیخ رہا تھا۔

شام چار بجے جنازہ اُٹھایا گیا۔ جنازہ پڑھا گیا تو لوگوں نے باری باری آفتاب کا چہرہ دیکھا۔ جب تمام لوگ چہرہ دیکھ چکے تو آفتاب کا بڑا بھائی ارشد اچانک کھڑا ہو گیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ اے گاؤں والو! تابوت چونکہ ہر ایک کو بہت پسند آیا ہے۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تابوت گاؤں والوں کو دے دیں تاکہ وہ اپنے مرنے والوں کو اِس میں ڈال کر قبرستان لے آیا کریں۔ ارشد کے اِس اعلان پر تمام لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے اِس بات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرمایا، ارشد نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے بھی لاش کو ایلومینم کے تابوت میں دفن کرنا شرعاً جائز نہیں۔ منکر نکیر کو دقت پیش آتی ہے۔ ارشد کے اِس اعلان اور مولوی کے فتوے کی وجہ سے میرے اور ڈاکٹر کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اِن کا منہ نوچ لیں مگر ایسا نہ کر سکے۔

خیر جنازہ پڑھنے کے بعد اکثر لوگ چلے گئے چند ایک رُکے رہے یہاں تک کہ تابوت کو قبر کے نزدیک لے جا کر کھولا گیا۔ تین لوگوں نے مل کر آفتاب کی لاش باہر نکالی۔ دوسرے لوگوں نے کلمہ شہادت بلند کیا۔ اُس کے بعد دو شخص قبر میں اُترے اور کلمہ شہادت کے ورد کے ساتھ قبر میں اُسے ننگی زمین پر لٹا دیا، پھر مٹی ڈالے جانے لگی۔

اِس تمام عمل کے دوران مَیں اور ڈاکٹر تماشا بنے کھڑے رہے۔ ہم نے نہ تو کلمہ شہادت پڑھا، نہ لاش کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی مٹی ڈالی، جیسے مرنے والا کوئی اجنبی ہو۔

والٹر کا دوست

کالج میں میرا پہلا دن تھا اور پچاس لڑکوں کی کلاس میں کوئی دوست نہ تھا۔ گاؤں کے اسکولوں میں میٹرک کرنے والے لڑکوں میں جو ایک قسم کا احساس کمتری پایا جاتا ہے، وہ مجھ میں بھی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں سب سے آخر میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس دن اساتذہ نے جتنے لیکچر دیے ایک کی بات بھی میرے پلے نہ پڑی۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی ایسے ہی گزرا۔ گاؤں کی پچھلی پندرہ سولہ سالہ زندگی میں کبھی کبھار ہی شہر میں آیا تھا۔ لہٰذا اجنبیت ایک فطری عمل تھا۔ کچھ لڑکے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے تو میں شرما سا جاتا اور شہری لڑکوں کی خود اعتمادی پر رشک کرتا جو مجھ میں بہرحال نہ تھی۔ چوتھے دن جونہی کلاس میں داخل ہوا سامنے کے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے دن سے ہی وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید میں اُس کی دعوت نظر انداز کر جاتا لیکن مجھے اس میں ایک کشش محسوس ہوئی۔ سیاہ آنکھوں، چمکتے بالوں اور گول مول سرخ و سفید چہرے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کتابیں رکھ کر اُس سے ہاتھ ملایا تو مجھے انتہائی نرماہٹ اور فرحت کا احساس ہوا۔ بیٹھنے کے چند ثانیوں بعد ہی اس نے سرگوشی سے کہا "میرے دوست بنو گے"؟ میں نے جلدی سے "ہاں" میں سر ہلا دیا۔

پھر اگلے چند دنوں میں ہماری دوستی مثالی کہلانے لگی۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنے پہلے تمام دوستوں اور سکول فیلوز کو نظر انداز کر دیا۔ ہمارے پانچوں پیریڈ اکٹھے تھے۔ عمر کا باپ کشمیری تھا۔ جس کا شہر میں ایک بڑا قالینوں کا کارخانہ تھا۔ اس نے عمر کو ایک موٹر سائیکل لے دی تھی۔ وہ روزانہ صبح مجھے بسوں کے اڈے سے پک کر لیتا اور کالج سے چھٹی کے بعد وہیں بس پر بٹھا کر اپنے گھر جاتا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ باتیں کرتے کرتے گاؤں تک چھوڑ گیا۔ پھر اکثر دوپہر کا کھانا

اُن کے گھر ہی کھانے لگے۔ کئی دوسرے لڑکوں نے ہمارا دوست بننے کی کوشش بھی کی مگر ہم اُن کے ساتھ ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ کینٹین، لائبریری، کمپنی باغ اور شہر میں بیٹھنے کی جتنی جگہیں تھیں، ہم دونوں نے کھوج ڈالیں۔ گھنٹوں Statistics اور دوسرے مضامین پر مل کر کام کرتے۔ حتیٰ کہ کالج وقت کے بعد ٹیوشن بھی ایک ہی ٹیچر کے پاس رکھے۔ الغرض اس ایک سال کے عرصے میں ہمارا تعلق اس قدر بن گیا کہ گاؤں سے شہر کا فاصلہ اگرچہ آٹھ کلو میٹر تھا لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی ایک دوسرے کو ملنے روز آتے جاتے رہے۔

علاوہ اِس کے عمر نے میری طبیعت میں ایک اور طرح سے بھی دخل دیا کہ میں تھوڑے ہی عرصے میں جینز پہننے لگا۔ قد و قامت، رنگ اور نین نقش میں شاید ہی کوئی لڑکا کالج میں ہوگا جو میرے مقابلے میں آتا ہو اس لیے کہ گاؤں کی صاف آب و ہوا اور دودھ مکھن بچپن ہی سے میری خوراک کا حصّہ تھے لہٰذا میرے اندر بھی ایک قسم کا غرورِ حسن پیدا ہو گیا اور میں چال ڈھال میں ایک شعوری ناز نخرہ دکھانے لگا۔ بہر حال کالج کے پہلے سال نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا اور عمر کی صحبت میں ایک قسم کا احساسِ برتری بھی پیدا ہو گیا کہ عام لڑکوں سے ہم دونوں شکل و صورت، ذہانت اور روپے پیسے میں برتر تھے کیونکہ اُن دنوں میرے ابا بھی کویت میں تھے۔

اگلے برس ہم دونوں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو کر سیکنڈ ایئر کے پیریڈ لینے لگے اور فرسٹ ایئر میں نئے لڑکے آ گئے۔ نئے آنے والوں میں ایک انگریز لڑکا بھی تھا۔ جو کالج میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ سنہری بال، نیلی آنکھیں، چٹا اور نکلتا ہوا قد سب کو اپنی طرف کھینچنے لگا لیکن وہ کچھ زیادہ ہی مغرور تھا۔ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ بدتمیزی کی حد تک خود اعتمادی اور بے نیازی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ اساتذہ کے ساتھ بھی ایسے ہاتھ ملاتا گویا ان پر احسان کر رہا ہو۔ اس کے کالج میں آنے کے بعد ہماری انانیت کو کچھ ٹھیس ضرور پہنچی۔ لیکن دو ہی ماہ بعد اچانک ایک خوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ والٹر نے کالج ٹائم کے بعد اُسی ٹیچر کے پاس Statistics کی ٹیوشن رکھ لی جس سے ہم پڑھ رہے تھے چونکہ وقت بھی ایک ہی تھا۔ اس لئے چند ہی دنوں میں وہ ہمارا دوست بن گیا۔ پھر جلد ہی مزاج بھی مل گیا۔ کالج میں بھی وہ ہمارے ہی ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ اس طرح ہماری دوستی ٹرائی اینگل کی شکل اختیار کر گئی۔ والٹر اردو اور انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ شہر کے ساتھ اُس کے والد کی دو ہزار ایکڑ زمین تھی۔ تقسیم کے وقت والٹر کے اجداد نے یہ زمین

پاکستان کی حکومت سے خرید کر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور برطانیہ واپس نہ گئے۔ لیکن یہاں کے کالے عیسائیوں سے اُن کی کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ شادی بیاہ کے سلسلے برطانیہ ہی میں تھے۔ وہ جب چاہتے لندن چلے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ والٹر برطانیہ میں رہنا ناپسند کرتا تھا۔ میرے پوچھنے پر ایک دن اُس نے بتایا کہ یہاں کے لوگ میری بہت عزت کرتے ہیں۔ مجھ میں ایک قسم کا احساسِ برتری موجود رہتا ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی جھک کر اور ادب سے پیش آتا ہے۔ ایک دفعہ مَیں ڈیڈی کے ساتھ ایک بڑے سرکاری افسر کے گھر دعوت پر گیا تو اُس نے اپنی بیٹی کو میرے استقبال کے لئے دروازے پر بھیجا جس نے اپنے ہاتھ سے مجھے ڈرنک بھی کرائی۔ جب میں سُرور میں آ کر بیڈ پر گرا تو اُس نے میرے جوتوں کے تسمے بھی کھولے۔

لیکن جو رومانس کا لطف انگلینڈ میں ہے وہ تو یہاں نہیں۔ ایک سے ایک لڑکی کھلے عام وہاں ملتی ہے۔ مَیں نے مزہ لیتے ہوئے کہا، Brother, you don't know about it. والٹر تفاخرانہ لہجے میں بولا، کہو تو بڑے بڑے رئیس خانوں کی لڑکیاں کھنچی چلی آئیں اور پھر جو عاجزی اور جوانی و جذبہ اِن میں ہے وہ لندن کی متکبر حسینوں میں کہاں؟ ویسے بھی مجھے ہندوستانی سفید رنگ پسند ہے۔ I like them.I want to live like a Prince and Pakistan is suitable place for this. جب کہ برطانوی مجھے امتیازی مقام نہیں دیتے۔ وہاں تو احمقوں نے نوکر اور آقا کی تمیز بھی ختم کر دی ہے۔ کسی کو ڈانٹو تو حرامی قانون کی دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ ذیر علی، یہاں حکم چلانے میں جو لطف ہے وہ لندن میں کہاں؟

لیکن وہاں تعلیم تو اچھی ہے، میں نے ایک اور دلیل پیش کی۔

"مجھے اچھی تعلیم کی ضرورت نہیں ویسے اچھی تعلیم تو لاہور میں بھی ہے۔" وہ بولنے لگا۔ لیکن مجھے یہی شہر پسند ہے۔ چلتی نہریں، لہلاتی فصلیں، بھرے باغات اور نوکروں کی فوج میں ہی میرا دل لگتا ہے۔ مجھے نوابی کلچر پسند ہے۔ کالج میں تو صرف دل بہلانے آتا ہوں۔ دراصل میں نواب بننا پسند کرتا ہوں۔ I am a Nawab, Walter is Nawab. اور والٹر ایک دم لہر میں آ گیا۔ اور ہم اُس کی اس سرشاری کی حالت سے لطف لینے لگے۔ اس سب کے باوجود ہم نے دیکھا کہ ہمیشہ چھٹیوں میں وہ لندن چلا جاتا۔ پھر اگست تک کے دن وہیں گزارتا۔ یہ سب کچھ تو تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ والٹر نے ایک انگریز ہوتے ہوئے بھی کوئی کتا نہیں پالا تھا

حالانکہ اس کے باپ کے پاس عمدہ نسل کے کئی کتے تھے۔

والٹر کبھی کبھار چرچ بھی چلا جاتا۔ دو تین دفعہ مجھے اور عمر کو بھی ساتھ لے گیا۔ اب کالج میں میرا اور عمر کا وقار مزید بلند ہو گیا تھا کالج کے باہر اکثر اوقات لوگوں کی مرعوبیت اس قدر بڑھ جاتی کہ راہ چلتے ہمیں دُور ہی سے سلام کرتے اور بعض آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے گھٹنوں تک جھک جاتے۔ بلکہ اب تو کبھی میں اور عمر اکیلے بھی ہوتے تو شہر کے کئی آدمی ہمیں رشک سے دیکھتے ہوئے سلام کر دیتے۔ ویسے بھی ہمارے اور والٹر کے رنگ میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ کالج میں والٹر کا ایک اور دوست یوسف مسیح بھی تھا۔ جو اتنا کالا تھا کہ افریقی بھی اُس پر رشک کریں والٹر اُسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔ وہ شہر کے چرچ سکول میں اُس کے ساتھ ہی پڑھا تھا اور شہر کے ساتھ ہی کے دیہات کا غریب عیسائی تھا۔ شاید والٹر اُس کی مالی مدد بھی کرتا ہو۔ والٹر کی کتابیں ہمیشہ وہی اُٹھاتا، ضرورت کی کوئی چیز منگوانا ہوتی، تو بھی وہی لا کر دیتا۔

والٹر کا گھر فروٹ فارم کے درمیان نہر کے کنارے انتہائی وسیع رقبے پر تعمیر ہوا تھا اور بڑے بڑے سایہ دار درختوں سے گھرا تھا۔ برگد، پیپل اور آم کے درختوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی کئی نہریں بہتیں تھیں۔ جو دُور تک پھیلے ہوئے باغوں کو پانی سے سیراب کرتیں۔ گھر کے صحن میں رنگ برنگے پھولوں کے بڑے بڑے تختے بچھے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے پرندے چہکتے اور تتلیاں رقص کرتی رہتیں۔ کوٹھی مغلیہ اور انگریزی فنِ تعمیر کا امتزاج تھی۔

اُس نے کبھی ہمارے ساتھ عیسائیت پر بات نہیں کی اور نہ ہی ہم نے اُسے مسلمان کرنے کی کوشش کی کیونکہ ایک تو ادھر اُدھر کی خوش گپیوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ دوئم عملی طور پر ہم دونوں میں بھی مسلمانوں والی کوئی بات نہ تھی بلکہ ہمارا پورا گیٹ اپ Play Boys کا تھا۔ البتہ یوسف مسیح جب عیسیٰ کا تذکرہ کرتا تو ہم بڑے مودب ہو جاتے۔ وہ ہمیں اکثر عیسیٰ کی انسان دوستی اور مساوات کے واقعات سناتا۔ جنہیں والٹر ایک قسم کی بے توجہی سے سنتا مگر جناب عیسیٰ کے نام پر اپنے سینے پر ہاتھ کے اشارے سے صلیب ضرور بناتا۔ شروع شروع میں ہم والٹر کے ساتھ گپ تو لگاتے رہے لیکن اکٹھے چائے وغیرہ پینے کا کبھی موقع نہ ملا۔

ایک دن ہم لائبریری کی طرف جا رہے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا اور سخت گرمی تھی۔ میں نے کالج کے الیکٹرک کولر سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی مگر والٹر نے مجھے اشارے سے روکا اور اپنی

گاڑی کی چابی یوسف مسیح کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ جلدی سے کار میں پڑے کولر سے منرل واٹر کی بوتل نکال لائے۔ یوسف نے بغیر کسی تاخیر کے بوتل لاکر والٹر کے حوالے کردی۔ والٹر نے ڈسپوزیبل گلاس بوتل سے الگ کیا اور اُس میں پانی ڈالنے لگا۔ اُس کے اس عمل کے دوران میں نے دل میں خیال کیا، والٹر کہیں پانی پہلے پی کر گلاس جوٹھا نہ کردے۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ یعنی اُس کے بعد جوٹھے گلاس میں پانی نہ پئیں گے تو والٹر دوستی سے بدگمان ہو جائے گا اور اگر پئیں گے تو آخر کو ہم مسلمان ہیں اور یہ چاہے جتنا بھی خوبصورت ہو مگر ہے تو عیسائی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُس نے پانی کا گلاس مجھے تھمادیا۔ جس کی وجہ سے فوراً میری پریشانی دُور ہوگئی۔ لہٰذا میں نے وہ گلاس عمر کی طرف کردیا۔ دوسرا گلاس پھر اُس نے مجھے دے دیا جو میں پی گیا۔ تیسری دفعہ اُس نے گلاس بھر کر خود پی لیا۔ اس دوران پانی کی بوتل ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا یوسف کو پانی الیکٹرک کولر ہی سے پینا پڑا۔ خیر اُس دن ہم نے شکر کیا کہ ہمارا ایمان بھی بچ گیا اور دوستی بھی قائم رہی۔

بہر حال یہ دوستی کے ابتدائی دنوں کی باتیں تھیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ جب ہم مل کر کینٹین جانے لگے اور خوب گھل مل گئے تو ہمیں اپنے ایمان کی کوئی زیادہ فکر نہ رہی۔ پھر تو جان بوجھ کر ایک دوسرے کا جوٹھا کھانے پینے لگے۔ بہت سے کالج کے لڑکے ہمیں طعنہ زنی بھی کرتے کہ عیسائی کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے ہیں۔ لیکن ہم نے اُن کی کوئی پرواہ نہ کی، ہم جانتے تھے یہ حسد کرتے ہیں۔ اگر کبھی اُنہیں موقع ملے یا والٹر اُنہیں منہ لگائے تو یہ کبھی پیچھے نہ ہٹیں۔

کالج میں سٹوڈنٹس کی بہت سی سیاسی تنظیمیں تھیں۔ لیکن ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شروع شروع میں اکثر تنظیمی لڑکوں نے ہم پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر والٹر کی طاقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ جو اُسے اپنے معاشی اور نسلی پس منظر سے حاصل تھی۔ اس کے باوجود ایک تنظیم کے چند ملا قسم کے لڑکے کسی بھی طرح سرنگوں ہونے میں نہیں آتے تھے۔ وہ آئے دن زک دینے لگے۔ کبھی سٹرائیک کرتے کہ کالج سے غیر مسلموں کو نکالا جائے۔ کبھی عمر اور مجھ پر دباؤ ڈالتے کہ والٹر کی دوستی سے الگ ہو جائیں۔ جب ہم کسی بھی طرح سے باز نہ آئے تو اُنہوں نے کینٹین میں ہمارا داخلہ منع کردیا کہ ہم کینٹین کے برتن ناپاک کردیتے ہیں۔ ایک دن جب ہم کینٹین میں چائے پینے کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے، اُسی مذہبی تنظیم کے سربراہ

نے پچاس لڑکوں کے ہمراہ کینٹین کا گھیراؤ کر لیا۔ ہمیں ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی اور دھکے دے کر کینٹین سے باہر نکال دیا۔ علاوہ ازیں ہمیں زدوکوب بھی کیا بلکہ سب سے بڑا ظلم تو انہوں نے یہ کیا کہ یوسف بیچارے کے کاندھوں پر "پلید کتا" کا سٹکر بھی چپکا دیا۔ اس دن ہمیں شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ والٹر تو آگ کی طرح تپنے لگا۔ بڑی درشتی سے خدا جانے انگریزی میں کیا کیا بولتا گیا۔ میں اُس ملازم کے سے اُلجھنے لگا تو عمر نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

مگر والٹر کسی طرح بھی اعتدال پر نہیں آرہا تھا۔ کہنے لگا کینٹین میں اگر چائے پئیں گے تو ابھی، اس حرامزادے ملا نے سمجھا کیا ہے۔ فوراً ہم تینوں کو کار میں بٹھا کر ڈی سی آفس کی راہ لی اور بغیر اجازت کے اندر گھستا چلا گیا۔ اُس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے ہی عمر کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈی سی صاحب دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر بڑے تحمل سے ہم تینوں کو بیٹھنے کا کہا۔ والٹر پانچ منٹ تک ڈی سی کے ساتھ مسلسل بولتا رہا۔ کہنے لگا فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہوگا۔ پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

Where is Yousaf ? وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ڈی سی صاحب نے گھنٹی دے کر پی اے کو بلایا اور اُسے کہا کہ باہر کوئی یوسف لڑکا ہے؟ پی اے نے نہایت مودب ہو کر کہا، سر باہر ایک عیسائی لڑکا یوسف مسیح موجود ہے، اُسے ہم نے باہر روک کر ویٹنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ اوکے اُسے بٹھاؤ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ سے میری بات کراؤ۔

دو گھنٹے بعد کالج کی اسلامی تنظیم کے سربراہ سمیت چھ لڑکے ہمارے سامنے ڈی سی صاحب کے کمرے میں مجرموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے انہیں آگے دھکیلتے ہوئے فخریہ مسکرا کر کہا، سر انہیں ڈرائنگ روم کی سیر کروا کے آپ کے پاس لائے ہیں اور لیڈر کے بالوں کو کھینچتے ہوئے بولا۔ سر یہ نواب کا بیٹا مجھے بڑی دھمکیاں دیتا تھا۔

تمام لڑکوں کے بل نکل چکے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ لیڈر کی آنکھوں میں ابھی تک مجرمانہ بے باکی موجود تھی۔ دو تین منٹ بعد ایس پی صاحب بھی وہیں آ گئے اور ڈی سی آفس میں عدالت لگ گئی۔

اب یوسف کو بھی اندر بلا لیا گیا جو پچھلے اڑھائی گھنٹوں سے ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا جس کی مرہم پٹی کے بارے میں شاید ابھی تک کسی کو بھی خیال نہیں آیا

تھا۔ ایک پانی کی بڑی بوتل اور گلاس بھی میز پر رکھ لیا اور اس کے بعد ایس پی صاحب نے یوسف مسیح سے کہا کہ اپنے ہاتھ سے اس گلاس میں پانی ڈالو اور دو گھونٹ خود پی کر اس مولانا کے بچے کو دو۔ ساتھ ہی اُن سے کہا اگر کسی نے ذرا بھی سرتابی کی کوشش کی تو دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے جایا جائے گا۔ یوسف مسیح باری باری اپنے منہ سے پانی جوٹھا کر کے ایک ایک لڑکے کو دیتا رہا اور وہ پیتے رہے۔ لیڈر کو دو دفعہ جوٹھا پانی کر کے پلایا۔ اس کے بعد پولیس اُن سب کو لے کر چل دی۔ اس سارے عمل میں والٹر، میں اور عمر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ محظوظ ہوتے رہے۔ کارروائی ختم ہونے پر والٹر نے یوسف کو ایک تھپکی دی، جواباً یوسف بھی تحسین حاصل کر کے مسکرا دیا۔ دوسری طرف پہلے ڈی سی صاحب اور پھر ایس پی صاحب نے ٹیلی فون پر والٹر کے والد مسٹر جون گیپ والٹر کو ساری واردات ہنس ہنس کر سنائی۔

....

اُس دن کے بعد والٹر ہمیں اپنی کار میں سیر پر بھی لے جانے لگا۔ کبھی دریا پر اور کبھی کسی میلے میں۔ بعض دفعہ ہمارے گرد بھی ایک مجمع سا لگ جاتا اور لڑکے بالے ہمیں کوئی آسمانی مخلوق خیال کرتے جس کی وجہ سے ایک انجانے تکبر کی گرانی ہمارے سر میں آ گئی۔ یوسف مسیح بھی ہمارے ساتھ ہوتا۔ خاص کر جب ہم شکار کے لئے نکلتے۔

والٹر کے گھر جانا اب ہمارا معمول بن چکا تھا۔ جہاں نوکروں کی ریل پیل تھی۔ وہ والٹر کی وجہ سے ہماری بھی عزت کرتے۔ گاہے گاہے ان پر ہم بھی حکم چلا کر لطف اندوز ہوتے۔ اکثر پلپلر اور برگد کے گھنے سایوں میں بیٹھ کر شطرنج کھیلتے، ان اوقات میں یوسف ہمارے پاس بیٹھا فقط دیکھتا رہتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی والٹر نے اسے کھیلنے کی دعوت دی ہو۔ شاید یوسف کو شطرنج کھیلنا ہی نہ آتی تھی۔

جون آیا تو کالج میں تین ماہ کی چھٹیاں ہو گئیں۔ والٹر نے ہمیں بتایا کہ وہ یہ تین ماہ لندن گزارے گا۔ یہ سن کر میں اور عمر کچھ اُداس ہو گئے۔

تعطیلات میں ابھی آٹھ دس دن باقی تھے کہ والٹر نے مجھے اور عمر کو اپنے گھر میں کھانے پر بلایا۔ ہم پہنچے تو والٹر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ جہاں یوسف مسیح آج پہلے سے موجود تھا۔ میں نے خیال کیا، شاید آج ہمارے ساتھ یوسف بھی کھانے میں شریک ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ کوفت سی ہوئی۔ دوسری طرف یوسف آج بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ غالباً اُسے اپنی قسمت پر

رشک آ رہا تھا کہ وہ اتنے خوبصورت دوستوں کے ساتھ رہتا ہے، جو اُسے اپنے ہی جیسا سمجھتے ہیں اور کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ہم نے والٹر کو کبھی کوئی حرام چیز کھاتے نہیں دیکھا سوائے بیئر کے۔ جب بھی سیر کو نکلتے تو وہ ہمارے لئے کوک، اپنے اور یوسف کے لئے بیئر کی بوتلیں رکھ لیتا۔ یوسف بیئر بہت خوش ہو کر پیتا تھا اور کبھی کبھی ہمارے مذہب میں بھی اُس کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیتا مگر والٹر نے ہم سے کبھی بھی اصرار نہ کیا تھا۔

آج سب سے پہلے ہماری کوک سے تواضع کی گئی۔ حسب معمول والٹر نے اپنے اور یوسف کے لئے بیئر ہی لا کر رکھی۔ نہایت آرام دہ ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے دو گھنٹے تک ہم گپیں ہانکتے رہے۔ اس کے بعد نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ والٹر ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ کھانا الگ الگ دو میزوں پر لگا ہوا تھا۔

ایک میز کے گرد تین کرسیاں اکٹھی تھیں جب کہ دوسری میز کے ساتھ صرف ایک کرسی تھی مگر کھانا دونوں میزوں پر ایک ہی جیسا تھا۔ والٹر نے بڑے پیار سے یوسف مسیح کو ایک کرسی والی میز پر بٹھا دیا اور خود میرے اور عمر کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

واپسی پر عمر مجھ سے کہنے لگا دیکھو یار علی انگریز ہر معاملے میں مساوات کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے اور یوسف کے کھانے میں اُس نے کوئی فرق نہیں رکھا۔ میں نے عمر کی تائید میں سر ہلانے کے ساتھ دل میں کہا حالانکہ ہماری میز کے گرد ایک کرسی کی مزید جگہ تھی۔

☆☆☆

شیدے نے پگڑی باندھ لی

مجھے فیصلے پر اعتراض نہیں تھا لیکن یہ بات نہ جانے کیوں میری سمجھ میں نہ آئی کہ جہاں بھی جرم ہوتا یہ دونوں سب سے پہلے موقع پر کیسے پہنچ جاتے۔ گاؤں میں ڈاکو آگھستا تو یہ پیچھا کرتے۔ چوری ہو جاتی تو کھوجیوں کے ساتھ چلتے۔ ایسا کئی دفعہ ہوا کہ گاؤں والوں کے برے بھلے میں کام آئے۔ لوگ انھیں تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے مگر جانے کیوں میں ان سے حسد کرتا۔ یہ جب بھی کوئی اچھا کام کرتے، میں جل اٹھتا۔ شاید اس لیے کہ وہ میری بالکل عزت نہیں کرتے تھے۔ یا پھر میں شکی مزاج تھا کہ ہر بات میں کیڑے نکالتا۔

بہر حال گاؤں کے معززین اور سکول کے اساتذہ نے باہمی اتفاق سے فیصلے پر دستخط کر دیے، کیونکہ یہ گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے گاؤں کی لڑکی کے ساتھ دوسرے گاؤں کا لڑکا عشق لڑائے۔ اس لیے اب وسیم کو حق نہیں تھا کہ وہ یہاں اپنی تعلیم جاری رکھ سکے بلکہ شکر کرے اُسے صرف مار پیٹ کر فارغ کر دیا گیا۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے اس فیصلے کو آفرین کہا اور شیدے کو شاباش دی، جس نے اپنے دوست فیکے گجر کے ساتھ مل کر رانی اور وسیم کو گنے کے کھیت میں جا دبوچا اور پکڑ کر پنچایت کے آگے کر دیا۔

سکول سے فارغ کرنے کے علاوہ وسیم کے والدین کو یہ بھی بتایا گیا کہ آئندہ اسے گاؤں کی حدود میں دیکھا گیا تو ذمے دار وہ خود ہوں گے۔

باوجود اس کے کہ مجھے وسیم سے کوئی ہمدردی نہ تھی مگر پہلے کی طرح آج بھی اُن کا یہ معرکہ اچھا نہ لگا۔ یہی حالت علوی کی تھی۔ علوی کا گھر بالکل میرے سامنے تھا۔ کوئی تیس کے پیٹے میں ہوگا۔ تعلیم اچھی تھی۔ عورت کی حیثیت پر بولنے کا اتنا چسکا کہ شاید کسی میں ہو۔ اس معاملے

میں اُس کی ہمدردیاں وسیم اور رانی کے ساتھ تھیں۔ شیدا اور فیکا گجر قابلِ نفرین تھے، جنھوں نے بیچ کھیت کھنڈت ڈال دی۔ بہرحال کچھ دنوں میں یہ قضیہ آیا گیا ہوا اور معاملات معمول پر آ گئے۔

ہائی سکول ہمارے گھر سے سو قدم کی راہ پر تھا اور سکول کی عمارت گاؤں کی آخری نکڑ پر تھی، جس کے آگے کھیت کھلیان شروع ہو جاتے۔ شام ڈھلے گاؤں کے مضافات کی فضا انتہائی رومانوی ہو جاتی۔ پرندے اندھیرا چھا جانے سے پہلے گھروں کو جانے لگتے۔ جب وہ سکول کے میدان کے اوپر سے قطار اندر قطار اڑتے اور افق میں آہستہ آہستہ گم ہوتے تو انھیں دیکھنے میں بہت مزا آتا۔ میں اور علوی روزانہ یہ نظارہ کرنے کے لیے سکول کے گیٹ کے آگے آ کر کھڑے ہو جاتے اور گھنٹوں کھڑے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے، یہاں تک کہ عشا کی اذانیں بھی وہیں پر سنائی دیتیں اور ہمارا یہ عمل اتنا متواتر ہو گیا کہ اگر کسی دن وہاں کھڑے نہ ہو سکتے تو محسوس ہوتا کوئی ہم سے فرض قضا ہو گیا۔

گاؤں کی اکثر عورتیں، جن کے گھروں میں رفعِ حاجت کا انتظام نہ تھا شام کے جھٹ پٹے میں ٹولیوں کی شکل میں کھلیانوں کا رخ کرتیں۔ رانی واقعے کے بعد غالباً ایک ماہ کسی کو نظر نہ آئی حتیٰ کہ رفعِ حاجت کے لیے بھی باہر آتی جاتی ہم نے نہ دیکھی۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر عورتوں کے ساتھ دیکھی جانے لگی۔ قریباً دو ماہ بعد تو یوں چلنے پھرنے لگی گویا کوئی واقعہ ہی نہ ہوا تھا۔

اس کا گھر ہماری گلی سے دوسری والی گلی میں تھا۔ شیدے اور فیکے کا گھر بھی اُسی گلی میں تھا۔ بلکہ فیکا تو عین اس کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔ اس کی بیٹھک کے آگے نیم کا سایہ دار پیڑ تھا، جس کے نیچے چارپائی پڑی رہتی۔ اب شیدے اور فیکے کا اکثر وقت اُسی چارپائی پر گزرتا اور خوب قہقہے اڑتے۔ دن گزرنے کے ساتھ قہقہے فقرے بازی میں بدل گئے اور گاؤں کے لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اب بات پڑوسیوں سے نکل کر دیگر لوگوں میں بھی چلی گئی لیکن سامنے آ کر کوئی نہ بولتا کہ دونوں جوان گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

اِدھر رانی غضب کی خوبصورت تھی اور گھر میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ایک بوڑھا باپ جو سارا دن بکریاں چراتا، شام تھکا ہارا سو جاتا، ماں کو مرے آٹھ سال ہوئے۔ چنانچہ کہاں تک بچتی، چند دنوں میں راہ پر آ گئی اور خفیہ اشارے ہونے لگے۔ پھر اشارے کھل کھیلنے میں تبدیل ہو گئے۔ مگر گاؤں میں ایسا کوئی بھونچال نہ آیا جس سے وہ محتاط رویہ اختیار کرتے۔ بلکہ رانی اب دونوں کے ساتھ بیچ بازار میں گپ مارتی اور قہقہے لگا کر ہنستی۔ ایک دفعہ تو میں نے خود اسے شیدے سے بات

کرتے دیکھا۔ بہت غصہ آیا اور میرا دل چاہا کہ اس کے خنجر گھونپ دوں۔ سارے گاؤں سے آنکھ لڑاتی مگر ان سے دور رہتی۔ جب میں نے یہ بات علوی کو بتائی تو اس نے بھی بے حیا کو بہت کوسا۔ کہنے لگا، دیکھو بھائی عورت حیا میں رہے تو رہے ورنہ یوں عقل سے جاتی ہے۔ خیر اس کے بعد ہم نے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔ شاید ہمارے پاس گفتگو کو اور بہت سے موضوع تھے۔ یا ویسے ہی وہ ہمارے خیال میں نہ آئی حتیٰ کہ تین مہینے گزر گئے۔

ایک دن ہم سکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے اور معمول کے مطابق ہمیں رات دس بج گئے۔ گاؤں میں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پچانویں فیصد دیہاتی سوئے ہوتے ہیں۔ اچانک ہمارے پاس سے تین آدمی گزرے جن میں دو کو ہم نے پہچان لیا۔ ایک شیدا اور دوسرا فیکا تھا۔ لیکن تیسرے آدمی کے سر پر پگڑی بندھی تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ قد دونوں میں چھوٹا تھا۔ باوجودیکہ چاندنی رات تھی لیکن ہماری پہچان میں نہ آیا۔ میں تو نظرانداز کر دیتا لیکن علوی کی متجسس آنکھیں بھانپ گئیں کہ ہو نہ ہو پگڑی والا مشکوک ہے۔ کہنے لگا، "آؤ ان کا پیچھا کریں"

اس وقت میری طبیعت بھی مہم جوئی پر آمادہ تھی، ہم نے انتہائی احتیاط سے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ انھیں محتاط فاصلے پر رکھتے فصلوں اور درختوں کی اوٹ سے تعاقب کرتے رہے۔ ہمیں ان کی باتیں سنائی نہ دیتی تھیں لیکن مبہم آوازیں ضرور آتیں جنھیں ہم نہ سمجھ سکتے تھے۔

اب ہم گاؤں سے قریب قریب دو کلومیٹر باہر آ گئے تھے اور سخت حیران تھے کہ گاؤں سے اتنا باہر آ جانے کے بعد بھی وہ کوئی عملی کارروائی نہیں کرتے بلکہ آگے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم اکتا کر مڑنے ہی والے تھے کہ شیدا اور فیکا رک گئے اور نالے کی پگڈنڈی پر بیٹھ گئے جبکہ پگڑی والا کھڑا رہا۔ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے جنھیں دور ہونے کی بنا پر ہم نہ سن سکے۔ پھر شیدے یا شاید فیکے نے اس کا بازو پکڑ کے کھینچا جس پر اس نے مزاحمت کی اور اس کی پگڑی کھل گئی۔ ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔ لمبے بال اور روشن چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جب دونوں نے زبردستی پکڑنے کی کوشش کی تو رانی نے چیخ ماری جس پر گھبرا کر دونوں نے چھوڑ دیا۔ پگڑی دوبارہ باندھ دی گئی اور پھر تینوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب ہماری حیرانی دوچند ہو گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اگر آمادہ نہیں تو گھر سے ساتھ آئی کیوں؟ مگر زیادہ تر ہمیں اپنی اشتیاق انگیز نگاہوں کی ناکامی پر افسوس تھا جو ابھی تک کچھ نہ دیکھ سکیں۔ خیر تجسس ہمیں ان کا پیچھا کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے

گاؤں کی حدود میں داخل ہو گئے۔ جب پڑوسی گاؤں قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تو تینوں پھر رک گئے۔ میں اور علوی ایک جھاڑی کی اوٹ لے کر ان سے کوئی تیس قدم پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد رانی اور شیدا تو وہیں بیٹھ گئے جبکہ فیکا آگے گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔

فیکے کے جانے کے بعد شیدے نے دوبارہ رانی کے ساتھ ہاتھا پائی شروع کر دی، جس پر رانی نے پھر مزاحمت کی اور شیدے کو نزدیک نہ آنے دیا۔ اب ہمیں رانی پر غصہ آنے لگا کہ یہ کیا چاہتی ہے اور شیدے پر اس سے زیادہ کہ زنخا ہے زبردستی کیوں نہیں کر لیتا۔ بہر حال ہمارا تجسس اور حیرانی بڑھ گئی تھی۔ شیدا اور رانی سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد (جس دوران مجھے اور علوی کو بہت کوفت ہوتی رہی کہ ناحق پیچھا کیا) فیکا واپس آ گیا اور ہم یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ہم سکون سے دیکھتے رہے کہ رانی (جس نے پگڑی اب اُتار دی تھی اور اسے شیدے نے سر پر باندھ لیا تھا) اور وہ نیا آدمی قریب کے خشک نالے میں چلے گئے۔ شیدا اور فیکا باہر بیٹھے رہے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد وہ دونوں باہر آ گئے۔ نیا شخص اپنے گاؤں کو مڑ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد شیدے نے رانی کو پکڑ لیا، مگر اب اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پھر شیدے کے بعد فیکا رانی کے ساتھ ایک نالے کی طرف چلا گیا۔ میں اور علوی اپنے گھر کی طرف چلے آئے لیکن سارا راستہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر گاؤں کے یہ دونوں غیرت مند رانی کو آدھی رات وسیم کے پاس کیوں لائے۔ بہت غور کیا لیکن ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھ ہم نہیں سکتے تھے کہ وہ دونوں گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

☆......☆......☆

MAAB 1431
maablib.org

یہ میری افسانوں کی کتاب قائم دین ہے۔ اسے ۲۰۱۲ میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے چھاپا تھا۔ یہی کتاب ہے جس سے مجھے بھرپور ادبی شناخت ملی۔ اس کی مقبولیت کے سبب مزید کام کرنے کا حوصلہ ہوا اور آج خدا کے کرم سے ڈھکی کوٹھی (ناول) سے ہوتے ہوئے شاہ محمد کے تانگے تک آ پہنچا ہوں۔ اب یہ قائم دین بھی سانجھ چھاپ رہا ہے، تاکہ اُن دوستوں تک بھی کتاب کی رسائی ہو جنھیں گلبرگ لاہور، بلیو ایریا اسلام آباد اور کلفٹن کراچی تک رسائی نہیں۔ خدا امجد سلیم کے ادارے سانجھ کو ترقی دے۔ قائم دین میں کل پندرہ افسانے ہیں۔ یہ کتاب یو بی ایل ایوارڈ بھی لے چکی ہے۔ آپ اسے پڑھیں اور اپنی رائے سے نوازیں۔ مجھے اسے لکھنے میں فخر ہے کہ میں نے یہ کہانیاں پرتعیش ڈرائنگ روم کے صاف قالینوں پر بیٹھ کر نہیں لکھیں، نہ مغربی فلسفوں کے لنڈے کی دھجیاں اکٹھی کی ہیں۔ آپ جانیں، یہ کہانیاں میری اور زمانے کی آپ بیتیاں ہیں، جنھیں میں نے جگر کے رنگوں اور خیال کے موقلم سے مصور کیا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل سید رضا زیدی نے بنایا ہے، کیا ہی دلدار شے ہے۔

علی اکبر ناطق

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323, Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com; sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN 978-969-593-207-4

300